ISSN: 2321-8339
جولائی-ستمبر ۲۰۲۱ء

ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اسلام کا شورائی نظام
سید جلال الدین عمری

شعب ابی طالب میں محصوری
ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی

احادیثِ احکام کی روایت میں امام ترمذیؒ کا اسلوب
محترمہ صائمہ ملک

تفہیم القرآن اور فی ظلال القرآن کا تقابلی مطالعہ (۲)
ڈاکٹر عظمیٰ خاتون

قرآن مجید کا تصور امن
مولانا محمد جرجیس کریمی

اقبال کا نظریۂ تعلیم
ڈاکٹر علی محمد بٹ

تعارف و تبصرہ

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی

اہم مطبوعات

معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدر الدین اصلاحی	110.00
اسلام۔ایک نجات دہندہ تحریک	مولانا سلطان احمد اصلاحی	90.00
عصر حاضر کا سماجی انتشار اور اسلام کی رہنمائی	مولانا سلطان احمد اصلاحی	125.00
عصر حاضر کی نفسیاتی الجھنیں اور ان کا اسلامی حل	مولانا سلطان احمد اصلاحی	80.00
اکیسویں صدی کے سماجی مسائل اور اسلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	140.00
قرآن، اہل کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	70.00
گھریلو تشدّد اور اسلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	30.00
حقائق، اسلام۔بعض اعتراضات کا جائزہ	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	56.00
حضرت ابراہیم۔امامِ انسانیت	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	85.00
ہم جنسیت کا فتنہ	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	28.00
احیائے اسلام: مفہوم۔مسایل، تقاضے	مولانا محمد جرجیس کریمی	85.00
جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	85.00
قرآن مجید اور مستشرقین	مولانا محمد جرجیس کریمی	72.00
اتحادِ امت کا مسئلہ: چند اہم گوشے	مولانا محمد جرجیس کریمی	34.00
اسلام کی امتیازی خصوصیات	مولانا محمد جرجیس کریمی	100.00
سیرتِ نبوی پر اعتراضات کا جائزہ	ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی	130.00
ملت اسلامیہ کے اختلافات	مولانا ضمیر الحسن فلاحی	65.00
قیامِ امن اور اسلام	مولانا کمال اختر قاسمی	100.00

ملنے کے پتے:

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی
نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ۔۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
D-307، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ——————— ستمبر ۲۰۲۱ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی **تحقیقات اسلامی** علی گڑھ

جلد: ۴۰ شمارہ: ۳

ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ ــــــــ صفر ۱۴۴۳ھ

جولائی ــــــــ ستمبر ۲۰۲۱ء

- مجلّہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر اپ لوڈ کردیے گئے ہیں۔
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات tahqeeqat@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

موبائل: 09897746586،09720357820،09837476030

ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

اکاؤنٹ نمبر: Tehqeeqat-e-Islami, Union Bank of India
Muslim University, Aligarh
A/. No. 452201010029001, IFSC, UBIN0545228

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۵۰ روپے
سالانہ	۲۰۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۸۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں و ادارے)	۳۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۵/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۰/امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۳۰/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۵/امریکی ڈالر

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی۔۶ سے چھپوا کر ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسلام کا شورائی نظام	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق و تنقید

شعب ابی طالب میں محصوری (سیرتِ نبوی کا ایک اہم باب)	ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی	۱۹
احادیثِ احکام کی روایت میں امام ترمذیؒ کا اسلوب	محترمہ صائمہ ملک	۴۱

بحث و نظر

تفہیم القرآن اور فی ظلال القرآن کا تقابلی مطالعہ (۲)	ڈاکٹر عظمیٰ خاتون	۵۱
قرآن مجید کا تصور امن	مولانا محمد جرجیس کریمی	۷۹
اقبال کا نظریۂ تعلیم	ڈاکٹر علی محمد بٹ	۹۵

تعارف و تبصرہ

علوم القرآن۔ ایک جائزہ	مولانا محمد انس مدنی	۱۱۳
رجوع، فہم اور تدبر قرآن	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۱۵
اشاریہ ششماہی علوم القرآن علی گڑھ	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۱۷
خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۸۰)	ادارہ	۱۱۹
مضامین کا انگریزی خلاصہ		۱۲۱ – ۱۲۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱- ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

muftimushtak@gmail.com

۲- محترمہ صائمہ ملک

جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد، پاکستان

smalikfsd@gmail.com

۳- ڈاکٹر عظمیٰ خاتون

علوی مینشن، نیوسبزی، اعظم گڑھ روڈ، شاہ گنج، جون پور (اتر پردیش)

uzma.anam15@yahoo.com

۴- مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

jarjeeskarimi@gmail.com

۵- ڈاکٹر علی محمد بٹ

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اونتی پورہ، سری نگر (جموں وکشمیر)

alimohd1265@gmail.com

۶- مولانا محمد انس فلاحی مدنی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

anasfalahi@gmail.com

۷- سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حرف آغاز

اسلام کا شورائی نظام

سید جلال الدین عمری

یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ جامعہ دارالسلام عمرآباد سے فراغت کے بعد میں مزید تعلیم جاری رکھنا چاہ رہا تھا۔غور وفکر اور مشورے کے بعد مرکز جماعت اسلامی رام پور کا انتخاب کیا۔ یہاں پہنچ کر مرکز کے اہل علم سے استفادہ کے ساتھ کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ میرا قیام ثانوی درس گاہ کے طلبہ کے ساتھ تھا۔ یہ سب جدید تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ ان میں تنہا میرا پس منظر مدرسہ کا تھا، لیکن ہمارے درمیان کسی قسم کی اجنبیت نہیں تھی۔خدمت دین کا جذبہ ہم سب کو جوڑے ہوئے تھا۔ان طلبہ کے درمیان علمی مذاکرے بھی ہوتے تھے۔ایک مجلس میں اسلام کا تصورِ شوریٰ زیر بحث رہا کہ اسلامی اجتماعیت میں اور اسلامی ریاست میں شوریٰ کی حیثیت اخلاقی اور مشاورتی ہوگی، یا اسے قانون کا درجہ حاصل ہوگا؟ اس وقت ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ موضوع غور وفکر اور تحقیق وتفتیش کا طالب ہے، اس کا تفصیل سے مطالعہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے قرآن، حدیث اور متعلقہ دینی مآخذ سے اس کا مطالعہ کیا اور اسے ایک مفصل مضمون کی شکل میں مرتب کردیا۔۱۹۶۵ء میں یہ ماہ نامہ زندگی رام پور میں تین طویل قسطوں میں تقریباً ایک سو صفحات میں شائع ہوا۔اس موضوع پر کوئی مستقل تحریر نہیں تھی، اس لیے ایک طالب علم کی اس کوشش کی اصحاب علم نے قدر افزائی کی۔

کئی سال بعد مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا ماہ نامہ میثاق جاری ہوا تو مولانا نے اس طویل مضمون کو مسلسل شائع کیا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جناب نعیم صدیقیؒ

نے اپنے ایک مکتوب میں اس پر طویل تبصرہ کیا۔ افسوس کہ وہ میرے پاس محفوظ نہیں رہ سکا۔ جناب اختر حجازی نے مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور سے نومبر ۱۹۸۲ء میں اسے کتابی شکل میں شائع کردیا۔ اس میں جناب سید اسعد گیلانی کی مختصر سی تحریر حرف اول کے نام سے شامل ہے۔ اس میں موضوع کی اہمیت اور کتاب کی تحقیقی کاوش کا ذکر ہے۔

اس کتاب کے مزید ایڈیشن مکتبہ تعمیر انسانیت ہی سے غالباً شائع ہوئے ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ کے تحت شوریٰ سے متعلق جو حاشیہ تحریر کیا ہے، بطور مقدمہ شریک اشاعت کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن: ج ۴، حاشیہ ۹۱، ص ۵۰۸۔۵۱۰، ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵۔

ہندوستان میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی اس کتاب کو اپنے ہاں سے شائع کرنا چاہ رہا تھا، لیکن میرا ارادہ اس پر نظر ثانی کا تھا۔ اس لیے اس کی اشاعت یہاں سے نہ ہوسکی۔

شوریٰ کے بارے میں میری رائے وہی ہے، جو اس مضمون میں ظاہر کی گئی ہے۔ اس تحریر پر چھ دہائیاں گزر چکی ہیں۔ اسے نظر ثانی کے ارادے سے ازسرنو دیکھا تو اس میں نئے مواد کا کوئی خاص اضافہ اس وقت دشوار طلب محسوس ہوا۔ البتہ کتاب کی پیش کش، ترتیب اور زبان و بیان کو مؤثر اور سبک بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اسے نئی ترتیب اور نئے قالب میں تحقیقات اسلامی میں پیش کیا جارہا ہے۔ دعا ہے، اللہ تعالیٰ اسے تکمیل کو پہنچائے۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ اس مضمون میں معاصر سیاسی نظام، اس کے جمہوری اقدار اور اسلام کے سیاسی نظام کا تقابلی مطالعہ یا موازنہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ قرآن، حدیث اور تاریخ کی روشنی میں شوریٰ کی حیثیت واضح کی گئی ہے۔

دور جاہلیت کا شورائی نظام

اسلام کے شورائی نظام سے اچھی طرح واقفیت کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھا جائے جس میں یہ نظام قائم و نافذ ہوا تھا۔

رسول اکرم ﷺ نے جس وقت سرزمین مکہ میں قریش کے درمیان صدائے توحید بلند کی اس وقت اس تہذیب ناآشنا قبیلے میں بہت سی سماجی، تہذیبی اور اخلاقی کمزوریوں کے ساتھ بعض ایسی اعلیٰ خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں جن سے ایک مضبوط ریاست کی تشکیل میں مدد لی جاسکتی تھی۔ یہ موادِ خام اس قابل تھا کہ اصلاح کے بعد اس کے ذریعہ سے ایک پائیدار اور مستحکم عمارت تیار کی جاسکتی تھی۔ان ہی میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ قریش کے اندر اجتماعی نظم اور مرکزیت کے اثرات نمایاں ہو چلے تھے، جس کی واضح مثال قصی کی ریاست کا وجود ہے۔اس شخص کا اقتدار تمام قبائلِ قریش پر حاوی تھا اور قبائل عرب کے قریش کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے سارے عرب میں اس کی عظمت کا سکّہ رواں تھا۔یہی نہیں بلکہ اس کے دور میں ہمیں ابتدائی طرز کا جمہوری یا پارلیمنٹری سسٹم بھی نظر آتا ہے۔قریش اپنے اہم معاملات قصی کی سرپرستی میں شوریٰ کے ذریعہ طے کرتے تھے۔

قریش کا تعلق قبیلۂ مضر سے ہے۔ یہ ادھر ادھر منتشر تھے۔قصی بن کلاب نے اس کی مختلف شاخوں کو حرم کے قریب آباد کیا اور ان کے مقامات متعین کیے۔حدود حرم سے دیگر قبائل کو نکالنے اور قریش کی آبادکاری کے لیے اسے مقابلہ آرائی بھی کرنی پڑی۔ان سب خدمات کی وجہ سے اس کی حیثیت غیر متنازع سردار کی تھی۔اس کے بارے میں ہمارے قدیم ترین سیرت نگاروں ابن سعد (م۲۳۰ھ) اور ابن ہشام (م۲۱۳ھ) نے خاصی تفصیل فراہم کی ہے۔ یہاں اس کے دارالندوہ سے متعلق ابن سعد کا بیان پیش کیا جارہا ہے:

كان قصى بن كلاب أول ولد كعب بن لؤى،أصاب ملكا أطاع له به قومه، فكان شريف أهل مكة لاينازع فيها، فابتنى دارالندوة وجعل بابها إلى البيت، ففيها كان يكون أمر قريش كله وما أرادوا من نكاح أو حرب أو مشورة فيما ينوبهم، حتى إن كانت الجارية تبلغ أن تدرع فمايشق درعها إلا فيها، ثم ينطلق بها إلى أهلها، ولايعقدون لواء حرب لهم ولامن قوم غيرهم إلا فى دارالندوة، يعقده لهم قصى، ولا يعذرلهم غلام إلا فى دارالندوة، ولاتخرج عير من قريش فيرحلون الا منها، ولا يقدمون إلا نزلوا فيها تشريفاً له وتيمناً برأيه ومعرفة بفضله، ويتبعون أمره كالدين المتبع لايعمل بغيره فى حياته وبعد موته، وكانت إليه الحجابة والسقاية والرفادة واللواء والندوة وحكم مكة كله، وكان يعشر من دخل مكة سوى أهلها، قال: وإنما سميت دارالندوة لأن قريشاً كانوا ينتدون فيها، أى يجتمعون للخير والشر.[۱]

''اس نے دارالندوہ بنایا اور اس کا دروازہ بیت اللہ کی طرف رکھا۔اس میں قریش کے تمام امور انجام پاتے تھے۔جس میں شادی بیاہ، کسی سے جنگ یا کوئی اہم مسئلہ جو انہیں درپیش ہوتا، یہاں تک کہ لڑکی جوان ہوتی اور دوپٹہ کا استعمال شروع کرتی تو دوپٹہ وہیں کاٹا جاتا اور اوڑھایا جاتا، پھر وہ اپنے گھر جاتی۔وہ جنگ کا علم بلند کرتے اپنے درمیان یا دوسروں سے تو اس کا فیصلہ بھی یہیں ہوتا۔لڑکے میں جوانی کے آثار ظاہر ہوتے اور اس کے چہرہ پر سبزہ نکلنے لگتا تو اس کا اعلان بھی یہیں ہوتا۔ان کا عام قافلہ یہیں سے روانہ ہوتا اور واپسی میں پہلے یہیں حاضر ہوتا۔اسے وہ اپنے لیے برکت کا باعث سمجھتے اور اپنے سردار کی برتری

۱۔ابن سعد، الطبقات الکبری: ۱/۷۰، ج ۱،ص ۱۵۹۔۱۶۵۔ابن ہشام نے بھی قصی بن کلاب کے بارے میں کسی قدر اختصار کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے۔

کا اعزاز تصور کرتے۔وہ اس کے احکام پر دین کی طرح عمل کرتے، جس کے خلاف زندگی میں اور اس کی موت کے بعد عمل نہیں ہوسکتا۔ اسی کے پاس حجابہ (بیت اللہ کی نگرانی) سقایہ (حاجیوں کے لیے پانی کی فراہمی) رفادہ (حج کے زمانہ میں باہر سے آنے والوں کی مہمان نوازی) جنگ کا علم اور مجلس کی سرداری سب مناصب جمع تھے۔ جو لوگ مکہ سے باہر کے آتے ان سے عشر لیتا۔اسے دارالندوہ اس لیے کہا جاتا کہ قریش وہاں اکٹھا ہوتے اور باہم گفتگو کرتے۔ معاملہ خیر کا ہوتا یا شر کا۔''

آں حضرتؐ کی ہجرت کے سلسلہ میں ابن ہشام لکھتے ہیں:

فحذروا خروج رسول اللہ ﷺ وعرفوا أنه قد اجمع لحربهم فاجتمعوا له فی دارالندوۃ وهی دار قصی بن کلاب التی کانت قریش لا تقضی امراً الا فیها یتشاورون فیها۔[1]

''آں حضرتؐ کے ہجرت کرجانے سے قریش خوف زدہ ہوگئے اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ آپ ان سے جنگ کی تیاری کررہے ہیں۔ چناں چہ وہ دارالندوہ یعنی قصی بن کلاب کے گھر پر مشورہ کے لیے جمع ہوئے اور قریش کسی اہم معاملہ کا فیصلہ اس مقام پر جمع ہوکر مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔''

ایک عربی مصنف ڈاکٹر ابراہیم فلپ ہٹی اور دیگر مورخین کے حوالے سے کہتے ہیں کہ عرب میں سردار قبیلے کو آزاد قبیلہ پر اقتدار مطلق حاصل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی ذمہ داری تھی کہ قبیلہ کی مجلس جو ذمہ داروں پر مشتمل ہوتی اس سے مشورہ کرے۔ سردار قبیلہ کا

ا۔ابن ہشام کا بیان ہے کہ جب مشرکین نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اپنے بال بچوں کے ساتھ مدینہ جارہے ہیں تو انہیں اندیشہ ہوا کہ آپ بھی مدینہ روانہ ہوجائیں گے۔اس سلسلہ میں مشورے کے لیے ان کے تمام اصحاب الرائے اور دانش مند دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی غیر حاضر نہیں رہا۔ ج۱،ص ۲۲۷۔اس سے واضح ہے کہ دارالندوہ وہ تمام اہم معاملات میں باہم مشورے کا مرکز تھا اور وہیں غور وفکر کے بعد اجتماعی فیصلے ہوتے تھے۔

اقتدار اس وقت تک باقی رہتا جب اسے قبیلہ کی ہمدردی اور تعاون حاصل ہوتا۔ عربی اپنے مزاج کے لحاظ سے جمہوری ہوتا ہے۔[۱]

یہ تصریحات اس بات کا ثبوت ہیں کہ قریش ایک ایسے نظامِ حکومت سے آشنا تھے جس کی خمیر میں شورائیت پائی جاتی تھی۔ مکہ کے نظام کا یہ پہلو اسلامی روح کے عین مطابق تھا، اس لیے اسلام نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اسے باشندگان مکہ کو ایک ایسے نظام مملکت کا تصور دینے میں کوئی دشواری نہیں پیش ائی جس کی اساس شورائیت پر رکھی گئی ہو۔ یہیں سے یہ گتھی بھی حل ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید میں شوریٰ کی تفصیلات کیوں نہیں دی گئیں کیوں کہ قریش کا شورائیت سے مانوس ذہن صرف یہ جان کر کہ اسلامی معاشرہ کا نظم شورائی ہوگا از خود تفصیلی خدوخال ترتیب دے سکتا تھا اور جہاں کہیں فکروعمل میں کوئی خامی محسوس کی گئی اس کی اصلاح کردی گئی اور جزئی اور تفصیلی ہدایات کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔

۱۔ الاقتصاد الاسلامی مذھبا ونظاما: ۵۸/۱

اسلام کا نظامِ شوریٰ

سورۂ شوریٰ مکی سورت ہے۔ اس میں دین کی اصولی تعلیمات کا بیان ہے۔ اسی میں ایک مقام پر ان مومنین صادقین کی مدح وتوصیف کی گئی ہے جن کے لیے آخرت کی کامیابی مقدر ہو چکی ہے۔ سلسلۂ بیان میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ وہ صادق الایمان اور اعلیٰ کردار سے آراستہ افراد ہیں جو اللہ کے رسول کی دعوت کو دل وجان سے قبول کرتے اور اپنی ساری عملی توانائیوں کو اس کی اتباع میں لگا دیتے ہیں۔ اس وصفِ کلی کے بیان کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں، یعنی ان کا تعلق اپنے مولیٰ وآقا کے ساتھ حد درجہ پائیدار اور مستحکم ہوتا ہے۔ ان کی دوسری نمایاں ترین صفت یہ ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)

''ان کے معاملات باہم مشورے سے طے پاتے ہیں۔''

علامہ ابوبکر جصاص حنفیؒ فرماتے ہیں:

''ایمان واقامت صلوٰۃ کے ساتھ شوریٰ کا تذکرہ اس کی جلالتِ شان پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ امت مسلمہ مشورہ کرنے پر مامور اور اس کی پابند ہے۔''[۱]

قرآن کا ایک عام طرز یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ فوراً زکوٰۃ یا انفاق کا تذکرہ کرتا ہے اور اس سے مقصود حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی اہمیت اور ان کی غیر منفک حیثیت کو نمایاں کرنا ہوتا ہے، لیکن سورۂ شوریٰ کی مذکور الصدر آیت میں انفاق سے پہلے شوریٰ کا ذکر کیا گیا، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ شوریٰ کے اصول کو نظر انداز کر دینے کے بعد حقوق العباد کا تحفظ ناممکن ہے اور کسی ریاست کے بارے میں بھی یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ نظام مشاورت کے بغیر اس میں عدل وانصاف کا قیام ہو سکے گا۔

آیت میں وصفِ شوریٰ کو جملۂ اسمیہ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومنین کا یہ وصفِ امتیازی ایک دائمی وصف ہے، جو کسی بھی حال میں ان سے

۱۔ احکام القرآن: ۳/۴۷۵

منفک نہیں ہوسکتا۔ وہ کسی بھی وقت اپنے اجتماعی معاملات باہم مشورہ کے بغیر نہیں طے کرتے۔

امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''صحابۂ کرام کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے روبرو کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ جمع ہوتے اور مشورہ کے ذریعہ اسے طے کرتے۔ اللہ نے ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ وہ کسی معاملہ میں انفرادیت نہیں برتتے، بلکہ اس کے برعکس جب تک کسی مسئلے میں ایک رائے نہیں ہوجاتے اقدام نہیں کرتے۔''[1]

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

''انفرادی رائے سے اجتماعی رائے، جو باہمی مشورہ سے طے پائی ہو، زیادہ نافع ہے۔ اس لیے کہ ایک فرد کا جذبات وخواہشات سے مغلوب ہوجانا عین ممکن ہے، لیکن کسی جماعت کا مبتلائے ہوا وہوس ہوجانا ناممکن ہے۔ خصوصیت سے اعلیٰ مناصب اور شریعت کے بلند تر مراتب میں فرد کا ہوا وہوس سے محفوظ رہنا دشوار تر ہے۔''[2]

ترغیب شوریٰ

اسلام کو جس طرح کی اجتماعیت مطلوب ہے اور اپنے ماننے والوں کے درمیان وہ اخوت والفت، محبت ورأفت اور اتحاد ویگانگت کے جس ماحول کو فروغ دینا چاہتا ہے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ان کے درمیان شورائیت ہو اور وہ باہم مشورے سے اپنے اجتماعی امور طے کریں۔ انفرادیت اور استبداد کی روش اس سے میل نہیں کھاتی۔ اس سے اتحاد والفت کا نازک رشتہ مجروح ہوجاتا ہے۔ کوئی بھی باشعور شخص اسے اپنی تحقیر و تذلیل تصور کرے گا کہ اہم امور ومسائل میں اسے غیر متعلق رکھا جائے۔ صرف فرماں روا اور حکامِ بالا ہی فیصلے کے مجاز ہوں اور اس کی ذمہ داری ان پر عمل درآمد قرار پائے۔

۱۔ التفسیر الکبیر: ۴۱۵/۷

۲۔ الاعتصام: ۹۹/۳

بسا اوقات اس سے آدمی میں بغاوت کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ یہاں کوئی حکم راں مطلق نہیں ہے، شاہ وگدا، خادم ومخدوم، راعی ورعیت، سب ایک صف میں کھڑے ہیں اور ہر طرف الفت ومحبت کی خوش گوار فضا پائی جاتی ہے تو وہ خود کو معاشرہ کا ایک ذمہ دار فرد تصور کرے گا۔ اس کے اندر تعاون کے جذبات پرورش پائیں گے۔ اسلام اسی طرح کا ماحول پیدا کرتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی بکثرت احادیث میں شوریٰ کی ترغیب اور اس کے فوائد وثمرات کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں بعض احادیث پیش کی جارہی ہیں:

رأس العقل بعدالإيمان التودُّد إلى الناس ومايستغنى رجل عن مشورة.[۱]

(ایمان کے بعد سب سے بڑی عقل مندی لوگوں سے محبت ہے اور کوئی شخص مشورہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔)

شوریٰ کے فوائد اور اس کے عمدہ نتائج کو آں حضرت ﷺ نے ذیل کے الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے:

المشاورة حصن من الندامة وأمان من الملامة.[۲]

(مشورہ کرنا شرمندگی سے محفوظ رہنے کا ایک قلعہ ہے اور ملامت سے بچنے کی ایک امان گاہ ہے۔)

آپؐ کا ایک حکیمانہ قول ہے:

ماخاب من استخار ولاندم من استشار ولاعال من اقتصد.[۳]

(وہ آدمی ناکام نہیں ہوگا، جس نے استخارہ کیا اور اس شخص کو شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی جس نے مشورہ سے کام کیا۔ اور وہ شخص محتاج نہیں

۱۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، ۱۰/۱۰۹، قال المناوی رواہ الطبرانی باسناد ضعیف۔ التیسیر بشرح الجامع الصغیر، ۲/۲۴۔

۲۔ ابن الحاج المتوفی ۷۳۷ھ المدخل، ۴/۴۱۔

۳۔ رواہ الطبرانی فی المعجم الصغیر بروایۃ من اسمہ محمد، ص ۲۰۴۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط والصغیر............ ضعیف جدا۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۸/۱۸۱۔ نیز ملاحظہ ہو مناوی التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/۳۴۸

ہوگا جس نے خرچ میں میانہ روی اختیار کی۔)

اس سلسلہ کی ایک اور روایت ہے:

من أراد امراً فشاور فيه اِمرأً مسلما وفقه الله لأرشد أموره.[۱]

(جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے اور اس میں کسی مسلمان سے مشورہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے بہتر صورت کی راہ نمائی فرمائے گا۔)

حضور اکرمؐ نے امت کو یہ تعلیم دی ہے:

استعينوا على أموركم بالمشاورة.[۲]

(اپنے کاموں میں باہمی مشورہ سے مدد حاصل کرو۔)

امام ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں روایت کی ہے کہ ایک شخص نے آں حضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ حزم یعنی احتیاط اور مضبوطی کار کسے کہتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: **إن تشاور ذارأى ثم تطيعه**۔ ''تم کسی صاحب رائے سے مشورہ کرو اور اس کے مشورہ کی پابندی کرو۔[۳]

مذکورہ بالا روایات میں سند کے لحاظ سے گو ضعف ہے، لیکن وہ ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ اس موضوع پر صحیح روایات اس کتاب میں آگے آرہی ہیں۔

حضرت عمرؓ شوریٰ کے ذریعہ طے کردہ معاملات کے استحکام اور استواری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''ایک شخص کی رائے اکہرے اور کچے دھاگے کی سی ہے۔ جب دو رائیں کسی مسئلہ پر جمع ہوجاتی ہیں تو ان کی نوعیت دو مضبوط دھاگوں کی سی ہوجاتی ہے۔ جب کسی معاملہ میں تین رائیں متفق ہوجاتی ہیں

۱۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ عمرو بن الحصین العقیلی وھو متروک۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ۱۸۱/۸

۲۔ ابن الحاج، المدخل: ۴۱/۴

۳۔ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۱۱۲/۱۰

تو وہ ناقابلِ شکست ہو جاتی ہیں۔"[۱]

حضرت عمرؓ کا ایک اور ارشاد ہے:

"دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جن کے کام کرنے کے ڈھنگ بھی جدا جدا ہوتے ہیں: ایک تو وہ شخص جو معاملات میں، اپنی جیسی کچھ رائے ہوتی ہے۔ اسی کے مطابق فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جو مشکلات میں مشورہ کرتا ہے اور اہل الرائے کے مشورہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جو مشکلات میں حیران و سرگرداں رہتا ہے، نہ تو سیدھے طریقے پر اپنے معاملہ کو حل کر سکتا ہے، نہ کسی کی بات مان کر اس پر عمل کرتا ہے۔"[۲] (ان میں سے کس کا عمل درستی پر ہے؟ یہ از خود واضح ہے۔)

حضرت علیؓ کا قول ہے:

"مشورہ آدمی کا بہترین معاون ہے۔ بُری ہے وہ طاقت جس سے آدمی استبداد پر اتر آئے۔"[۳]

حضرت علیؓ ہی کا ایک دوسرا قول ہے:

"الاستشارة عين الهداية، وقد خطر من استغنى برأيه.[۴]

(باہمی مشورہ سے کام کرنا ہی اصل راہ نمائی ہے۔ وہ شخص خطرات میں گھِر گیا جس نے اپنی رائے کے ساتھ انفرادیت اختیار کی۔)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے:

"ایک دوسرے سے مشورہ کرنا اور آپس میں علمی مذاکرہ کرنا خیر و برکت کی کلید اور رحمت کے دروازے ہیں کیوں کہ ان دونوں کے اختیار

۱۔ عیون الاخبار: ۱/۳۱

۲۔ ابن الحاج، المدخل: ۴/۴۱

۳۔ حوالہ سابق

۴۔ حوالہ سابق

کرنے کے بعد کسی رائے کے بھٹک جانے اور حزم واحتیاط کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ نہیں ہے۔“ [۱]

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

واللّٰہ مااستشار قوم قطّ الاھدوا لافضل مابحضارتھم. [۲]

”قسم خدا کی۔ جب کوئی قوم آپس میں مشورہ کرتی ہے تو پیش آمدہ مسائل میں راہ صواب پالیتی ہے۔“

شوریٰ کی قانونی حیثیت

فرد اور جماعت کے لیے شوریٰ کی افادیت تسلیم شدہ ہے، البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت محض اخلاقی ہے، یا اسے قانون کا درجہ بھی حاصل ہے؟ یہ سوال خاص طور پر ریاست کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سربراہ اسلامی مشورے کا پابند ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں تین رائیں ہوسکتی ہیں۔ ان کا مختلف طریقوں سے اظہار بھی ہوتا ہے:

۱۔ امیر اور آمریت

ایک رائے یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا صدر اپنے اختیارات وتصرفات کے لحاظ سے قریب قریب ایک ڈکیٹیٹر کے مقام پر متمکن ہوتا ہے۔ اسلام نے اس پر جو کچھ حدود وقیود عائد کیے ہیں، وہ اس قدر کم زور اور ناقص ہیں کہ سربراہ چاہے تو ہر طرح کی بدعنوانیوں کی راہ نکال سکتا ہے۔ اسلام کے اس سے صرف اس قدر مطالبات ہیں کہ وہ اساساتِ دین کی خلاف ورزی نہ کرے، معروف کو فروغ دے اور منکر کو ختم کرے۔ نیز مملکت کے کاموں میں اہل الرائے سے مشورہ کرے، لیکن اسے شوریٰ کے فیصلوں کا پابند نہیں کیا گیا ہے۔ اگر وہ اصحاب شوریٰ سے مشورہ کیے بغیر یا مشورہ کے بعد ان کے متفقہ فیصلے کے علی الرغم کوئی اقدام کرجائے تو اسلام کے آئینِ سلطنت میں اس کے اس اقدام پر قدغن لگانے والی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے اور اگر وہ شوریٰ کے فیصلے کا خود کو پابند کرلے تو یہ اس کی ذاتی خوبی اور اخلاقی بلندی ہوگی۔

۱۔ حوالہ سابق

۲۔ بخاری، الادب المفرد، ص ۵۳

۲۔امیر کا تعطل

اس کے بالکل برعکس دوسری رائے یہ ہے کہ ریاست کے ہر جزئی وکلّی معاملے میں فیصلہ کن طاقت شوریٰ کی ہے اور امیر شوریٰ کے مشورہ کا بالکلیہ پابند ہے۔ وہ شوریٰ کے فیصلوں سے سرمو تجاوز کرنے کا قطعاً مجاز نہیں ہے۔ اگر کسی وقت امیر اس قسم کا اقدام کر جائے تو شوریٰ کو اس کی برطرفی کا مکمل اختیار ہوگا۔

۳۔امیر کی آزادی و پابندی

تیسری رائے یہ ہے کہ امیر تمام اساسی امور میں نمائندگانِ قوم کی رائے کا پابند ہے اور اسے یہ حق نہیں کہ ملک کے بنیادی اور فیصلہ کن معاملات کو ارباب حل وعقد سے مشورہ کیے بغیر طے کر دے۔ ان تمام معاملات میں جو ریاست کے اجتماعی مفاد پر اثر انداز ہو سکتے ہوں، قوم کے نمائندوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر اقدام کا اسے حق نہیں ہے۔ اگر سربراہِ ریاست اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اربابِ بست وکشاد کو یہ حق ہے کہ اسے اپنے منصب سے معزول کر دیں۔ باقی رہے روز مرّہ کے امور تو ان میں اسے مسائلِ متعلقہ میں درک وبصیرت رکھنے والوں سے مشورہ کرنا چاہیے لیکن وہ ان کی رائے اور مشورے کا پابند نہیں ہے۔ مختلف آراء میں سے کسی ایک رائے کا انتخاب اور اس پر عمل کا اسے حق ہے اور مشیروں کا یہ طبقہ ضروری نہیں ہے کہ قوم کے نمائندوں ہی پر مشتمل ہو، بلکہ اس کے لیے روزمرہ پیش آنے والے مسائل میں فہم وبصیرت سے بہرہ مند ہونا کافی ہے۔

یہی تیسری رائے کتاب وسنت کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اسوے سے اس کی تائید ہوتی ہے اور خلفاء راشدین کا تعامل اسی پر رہا ہے۔ آئندہ اس کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

مولانا سید جلال الدین عمری کی بعض
اہم کتابیں
احکامِ ہجرت و جہاد
صفحات: 180 قیمت: (PB) 160.00 (HB) 200.00
سائز: 23X36/16
اقامتِ دین
صفحات: 108 قیمت: 110.00
سائز: 23X36/16
اوراقِ سیرت
مولانا سید جلال الدین عمری
صفحات: 384 قیمت: 250.00
سائز: 23X36/16
عورت
اسلامی معاشرے میں
صفحات: 432 قیمت: 260.00
سائز: 23X36/16
راہیں کھلتی ہیں
صفحات: 152 قیمت: (PB) 95.00 (HB) 140.00
سائز: 23X36/16
تجلیاتِ قرآن
مولانا سید جلال الدین عمری
صفحات: 560 قیمت: 450.00
سائز: 23X36/16
MMI PUBLISHERS مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob: 7290092401, 7290092403
info@mmipublishers.net | mmipublishers@gmail.com mmipublishers.net

تحقیق و تنقید

شعبِ ابی طالب میں محصوری

(سیرتِ نبوی کا ایک اہم باب)

ــــــــــــــــــ ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی

شعب ابی طالب میں مسلمانوں کا محاصرہ اور ان کا سماجی مقاطعہ سیرت نبوی اور تاریخ اسلامی کا ایک اہم باب ہے۔ مکہ مکرمہ کی تیرہ (۱۳) سالہ زندگی میں سے تین اہم سال اس محاصرے اور مقاطعے کی نذر ہوئے تھے۔ اس دوران میں مسلمانوں نے اور ان کی حمایت میں تمام بنو ہاشم اور بنو مطّلب نے بڑی تکلیفیں اور سختیاں جھیلی تھیں۔ بچے اور بوڑھے سب نے بھوک و پیاس کی سختی برداشت کی۔ اس کی وجہ سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابو طالب کا ضعف بڑھ گیا اور یہ محاصرہ ختم ہونے کے کچھ دنوں کے بعد ان دونوں عظیم ہستیوں کی وفات ہوگئی۔ اسی طرح ان ایام میں دعوتی کام بھی محدود ہوکر رہ گیا تھا۔

شعب ابی طالب میں مسلمانوں نے بلا شبہ بہت تکلیفیں برداشت کیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ مشرکین ہر طرح سے مسلمانوں پر حاوی ہوگئے تھے۔ کچھ لوگوں پر ان کا قابو چلتا تھا اور ان پر وہ ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے تھے، لیکن مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت ان کی دست درازی سے محفوظ تھی۔

شعب ابی طالب کے محاصرے کے دوران میں بھی مسلمانوں کی طاقت میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔ اسی دور میں حبشہ کے بادشاہ نجاشی مسلمانوں کے حامی بن گئے، بلکہ خود بھی مسلمان ہوکر ملتِ اسلامیہ کا جزو بن گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے نجاشی سے براہ راست تعلقات قائم ہو گئے اور باہم خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا تھا۔ نجاشی کا مسلمان ہوجانا ایام محاصرہ کی ایک بڑی کامیابی تھی کیوں کہ ایسے حالات میں ایک ملک

کے سر براہ کا مسلمان ہوجانا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔نجاشی کے مسلمان ہوجانے سے حبشہ جوقریش کی تجارتی منڈی تھی وہ ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔اسی طرح اس عرصے میں مسلمانوں نے مشرکین کے اندر بھی اپنے ایسے حامی پیدا کر لیے جوان کے لیے جان دینے کو تیار ہوجاتے تھے۔چناں چہ جن لوگوں نے محاصرہ ختم کروایا تھا وہ باضابطہ مسلح ہوکرآئے تھے۔

سیرت کی تمام کتابوں میں شعب ابی طالب کے محاصرے کا ذکر ہے، لیکن بالعموم محاصرے کے ان تین برسوں کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔اس مدت میں پیش آنے والے واقعات اور سرگرمیوں کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ان حالات و واقعات کی جزوی تفصیلات میں سیرت نگاروں کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ شعب ابی طالب، مقاطعہ اور محاصرہ جیسے الفاظ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے جیسے یہ جگہ مکہ سے کچھ فاصلے پر کوئی پہاڑی درّہ یا گھاٹی تھی ،جس میں دشمنوں نے بنی ہاشم کو محصور کر دیا تھا۔بعض سیرت نگاروں نے واضح طور پر ایسا ہی تأثر دیا ہے۔مثلاً ابن سید الناس نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ مکہ کے لوگوں نے بنی ہاشم کو گھیر کر شعب میں محصور کر دیا تھا۔[۱]

اسی طرح کا انداز بیان ابن عبدالبر نے بھی اختیار کیا ہے:

فاجمع المشرکون من قریش علی منابذتھم و اخراجھم الی الشعب.[۲]

لیکن مستند مراجع کی روشنی میں حالات و واقعات کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شعب ابی طالب میں بنی ہاشم قید نہیں تھے، بلکہ وہ ان کے لیے جائے پناہ تھی، یعنی وہ گھاٹی ان کے لیے حصار یعنی قلعہ کی طرح تھی۔اس گھاٹی کے اندر رہتے ہوئے وہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت زیادہ بہتر طریقے پر کر سکتے تھے۔اس لیے وہ اپنی مرضی سے اس گھاٹی میں پناہ گزین ہوئے تھے، کسی نے ان کو گھیر کر محبوس نہیں کیا تھا۔

شعب ابی طالب کے واقعہ کی تاریخی طور پر بڑی اہمیت ہے، اس لیے تاریخ و سیرت کی کتابوں میں اس کا تذکرہ تفصیل سے موجود ہے۔اس مقالہ میں بھی انہی معلومات کو مرتب انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

واقعہ کا تاریخی استناد

احادیث کی کتابوں میں اس واقعہ کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ اس کی اصل تمام مستند مآخذ میں موجود ہے جیسے صحیح بخاری میں ہے:

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ یوم النحر کے دوسرے دن جب رسول اللہ ﷺ نے منیٰ میں قیام کیا تو آپؐ نے فرمایا: کل ہم خیف بنی کنانہ میں قیام کریں گے، جہاں لوگوں نے کفر کی حمایت میں قسم کھائی تھی۔ آپؐ کی مراد وادی محصّب تھی کیوں کہ یہیں پر قریش اور بنو کنانہ نے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطّلب یا بنی مطّلب کے خلاف حلف اٹھایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ نکاح کا رشتہ نہیں رکھیں گے اور خرید وفروخت کا تعلق بھی نہیں رکھیں گے، تاآں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے حوالے کر دیں۔''

(یعنی سماجی اور معاشی مقاطعہ کریں گے) [۳]

اس روایت کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں کم ازکم دس مرتبہ روایت کیا ہے۔ بعض مقامات پر الفاظ کا معمولی فرق بھی ہے۔ اوپر مذکور روایت انھوں نے باب تقاسم المشرکین علی النبی ﷺ کے تحت بیان کی ہے۔ یہ باب ہجرت حبشہ اور نجاشی کی موت کے ابواب کے بعد قائم کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک یہ واقعہ اسی دورانیے کا ہے۔

امام مسلم نے بھی اس حدیث کو تین الگ الگ اسناد سے ذکر کیا ہے۔[۴] ان کے الفاظ بھی تقریباً وہی ہیں جو بخاری میں آئے ہیں۔

ابوداؤد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ اس میں اس کے راوی حضرت اسامہ بن زیدؓ ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے ایک دن میں نے دریافت کیا کہ آپ کل کہاں قیام کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا: عقیل نے ہمارے لیے کوئی جگہ چھوڑی بھی ہے؟ (شعب ابی طالب کے مکانات حضرت عقیل کے تصرف میں تھے۔) پھر فرمایا: کل ہم خیف بنی کنانہ یعنی المحصب میں قیام کریں گے، جہاں بنی کنانہ نے قریش کے ساتھ مل کر قسم کھائی تھی کہ بنی ہاشم سے نہ رشتہ نکاح رکھیں گے اور نہ

خرید وفروخت کریں گے۔[۵] اسی کتاب کی اگلی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال منیٰ سے چلتے ہوئے دریافت کیا گیا تھا۔

یہ روایات شعب ابی طالب کے واقعہ کے لیے تاریخی استناد ہیں، ان کو تمام محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ شارحین حدیث نے ان احادیث کے ذیل میں شعب ابی طالب کا واقعہ ہی درج کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:

> ''امام بخاریؒ کے نزدیک اس واقعہ کی کوئی بات ثابت نہیں ہے، اس لیے انھوں نے صرف ابو ہریرہؓ کی روایت کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ چوں کہ اس روایت میں اصل واقعہ پر دلالت موجود ہے۔ جو کچھ اہل سیر نے لکھا ہے وہ ایک طرح سے 'تقاسموا علی الکفر' کی شرح ہے۔''[۶]

امام بخاریؒ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ کی یہ بات پوری طرح درست نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو دوسری جگہ (حدیث نمبر ۱۵۹۰ پر) بھی نقل کیا ہے۔ وہاں انھوں نے اس مقاطعہ کے الفاظ بھی لکھے ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام بخاری کو پورا واقعہ معلوم تھا۔ انھوں نے اس کی تفصیلات کو اس لیے نقل نہیں کیا کہ ان کے پیش نظر احکام بیان کرنے تھے، تاریخ نہیں۔

شعب ابی طالب کے واقعہ کے تاریخی استناد کے لیے مذکورہ بالا صحیح احادیث کے علاوہ اور بھی متعدد دلائل ہیں، جیسے ایک اہم دلیل حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ''ہم کو تین سال تک گھاٹی میں محصور رکھا گیا، ہمارا دانہ پانی بند کر دیا گیا، یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ ہم میں سے کوئی آدمی پیسے لے کر نکلتا، تا کہ کھانا خرید سکے، لیکن وہ خرید نہیں پاتا تھا۔ اسی حالت میں ہمارے بہت سے لوگ مر گئے۔''[۷]

یہ روایت اگر چہ حضرت ابن عباس کا اثر ہے، لیکن وہ خود شعب میں محصوری کے دوران میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے ان کی گواہی مستند ہے۔

محمد بن عبداللہ غبان الصبحی نے 'مرویات الوثائق المکتوبہ من النبی و الیہ جمعاً و دراسۃً' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے اس واقعے سے متعلق تمام روایات کا جائزہ لیا ہے اور سندوں کی تحقیق کی ہے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ

ہے کہ اس واقعے کی تفصیلات تاریخ وسیر کی کتابوں میں مذکور تو ہیں، لیکن ان میں روایتی اعتبار سے ایک بڑی کم زوری ہے، وہ یہ کہ اس واقعہ کی کئی روایات مرفوع نہیں ہیں، بلکہ مراسیل میں سے ہیں اور مرسل روایت حجت نہیں ہوتی ۔لیکن جیسا کہ معلوم ہے، تاریخی واقعات کے لیے مراسیل کو دلیل مانا جاتا ہے۔ویسے بھی ابن اسحاق کی زیادہ تر روایات ابن شہاب زہری کی ہیں جو براہ راست صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔تاریخی واقعات کے لیے یہ ایک مستند سلسلہ ہے۔

دوسری بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ اس واقعہ کی اکثر روایات میں اگرچہ ضعف پایا جاتا ہے لیکن وہ ضعف معمولی ہے اور تاریخی واقعات میں ایسی روایات کو دلیل بنایا جاسکتا ہے۔[۸]

بہرحال حدیث کی مستند کتابوں میں اس واقعہ کی اصل موجود ہے اور تاریخ و سیرت کی مستند کتابوں میں اس کی تفصیلات پائی جاتی ہیں اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ روایات احکام میں صحت کا جو معیار مطلوب ہے، تاریخ وسیرت کی کتابوں میں اس معیار کی ضرورت نہیں۔اس لیے شعب ابی طالب کی تفصیلات کو یہ کہہ کر رد کردینا کہ حدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیلات موجود نہیں ہیں، مناسب نہیں ہے۔یہ واقعہ پیش آیا تھا اور سیرت طیبہ کے تین برس اس کی نذر ہوئے تھے۔ ان تین برسوں کو تلاش کرنا کم ازکم سیرت نگار کی تو لازمی ذمہ داری ہے۔

شعب کی تاریخ

شعب کے معنیٰ گھاٹی کے ہیں۔یعنی پہاڑی درّہ یا دو پہاڑوں کے درمیان کی زمین ۔مکہ مکرمہ پورا پہاڑی علاقہ ہے۔اس لیے وہاں بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کو شعب یا گھاٹی کہا جاتا تھا۔ازرقی نے کم ازکم چالیس (۴۰) ایسے مقامات کا ذکر کیا ہے جو شعب کے نام سے مشہور تھے۔شعب ابی طالب بھی ایسی ہی ایک گھاٹی تھی۔ پہلے یہ گھاٹی عبد مناف کی ملکیت تھی۔انہوں نے اپنے زمانے میں اس گھاٹی کے دہانے پر ایک کنواں بھی بنوایا تھا۔جس سے عام لوگوں کو پانی لینے کی اجازت تھی۔[۹]

عبد مناف کے ایک بیٹے عبد شمس نے بھی اس گھاٹی کے باہر اس مقام پر ایک کنواں بنوایا تھا جس کو بعد میں دار عبدالمطلب یا دار ابن یوسف کہا گیا۔اس کنویں کو 'الطّوی' کہتے تھے۔۱۰

عبد مناف کے بعد یہ گھاٹی ان کے بیٹے ہاشم کے حصّے میں آئی۔اس کی وجہ سے اس کا نام شعب ہاشم ہوگیا۔ان کے بعد یہ گھاٹی عبدالمطلب کے حصے میں آئی۔انھوں نے اس کو اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔اس میں سے ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے والد جناب عبداللہ کو بھی ملا تھا۔ایک مشہور روایت کے مطابق اسی شعب میں آپؐ کی ولادت ہوئی تھی۔الفاکہی نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ رسول اللہ کی ولادت اسی شعب میں ہوئی تھی۱۲۔البتہ سہیلی کا خیال ہے کہ رسول اللہؐ کی ولادت شعب کے سامنے صفا پہاڑی کے پاس والے مکان یعنی دار عبدالمطلب میں ہوئی تھی۔فاکہی نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اسراء کی رات آپؐ اپنے اسی مکان میں قیام پذیر تھے اور یہیں سے اسراء کے سفر پر تشریف لے گئے تھے۔۱۳

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنا حصہ حضرت عقیل بن ابی طالبؓ کو ہبہ کر دیا تھا۱۴ اور جناب ابو طالب کا حصہ بھی حضرت عقیل کے ہی حصے میں آیا تھا۔اس شعب میں سے حضرت علیؓ کو حصہ نہیں ملا تھا۱۵۔عقیل بن ابی طالب نے اس شعب کے اندر ایک کنواں بنوایا تھا۱۶۔حجاج بن یوسف کے زمانے میں حضرت عقیل بن ابی طالب کے بیٹے نے اس شعب میں سے اپنا پورا حصہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کو فروخت کر دیا تھا۔۱۷

شعب ابی طالب کا پورا علاقہ تاریخ کے ادوار میں ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔عہدِ عباسی میں خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ خیزران اور بیوی زبیدہ کو بھی اس جگہ سے بڑی دل چسپی رہی ہے۔اس میں سے حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کا حصہ خیزران نے لے لیا تھا اور اس میں ان کی باندی خالصہ رہتی تھی اور مقوم بن عبدالمطلب کا حصہ زبیدہ کی باندی طلوب کے پاس تھا۔۱۸

تاریخ اسلامی کے پورے دورانیے میں شعب ابی طالب بہت مشہور رہی ہے۔ابتدائی اسلامی تاریخ کے یہ چند حوالے بطور نمونہ ذکر کردیے ہیں۔اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ معلوم ہوجائے کہ اس جگہ سے مسلمانوں کو کیسی گہری عقیدت اور والہانہ تعلق رہا ہے۔سچ یہ ہے کہ اس جگہ کی سب سے بڑی فضیلت تو یہ ہے کہ یہ مولد نبی ہے۔اس کے علاوہ اس جگہ سے عقیدت کی دوسری وجہ یہی ہے کہ یہ جگہ ایام مقاطعہ کے تین سال کی مشکل ترین تاریخ کی گواہ ہے۔بعد میں بعض لوگوں نے اس کا نام بدلنے کی کوشش کی اور اس کو شعب ابن یوسف کہنے لگے۔معجم البلدان میں اسی نام سے اس کا ذکر ہے۔ لیکن ایام مقاطعہ کا جو عظیم واقعہ اس گھاٹی سے منسوب ہوا، اس کی عظمت کے آگے ہر نسبت بے معنیٰ ہے۔ اس لیے آج بھی یہ گھاٹی شعب ابی طالب کے نام سے ہی معروف ہے۔

محل وقوع

شعب ابی طالب کوہ صفا کے سامنے کا نشیبی علاقہ ہے۔یہ شعب جبل ابوقبیس اور خنادم کے درمیان میں واقع ہے۔ابوقبیس اس کے بائیں طرف اور خنادم دائیں طرف ہے۔ابن اسحاق نے شعب ابی طالب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ناحیۂ مکہ میں واقع ہے۔[۱۹]

محصوری کا آغاز

شعب ابی طالب کوئی غیر آباد جگہ نہیں تھی، بلکہ یہ مکہ مکرمہ کے ایک محلے کی طرح تھی۔بنی ہاشم کے متعدد حضرات اسی شعب کے اندر رہتے تھے اور کچھ لوگ اس کے سامنے بھی رہتے تھے۔جب مقاطعے کا آغاز ہوا تو ایسا نہیں ہے کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہاں پناہ گزیں ہوئے ہوں، بلکہ وہ اپنے ہی گھروں میں محصور ہوئے تھے۔

روایات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقاطعہ کا یہ معاہدہ جو شعب ابی طالب میں محصوری کے نام سے معروف ہے، کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا، بلکہ حالات

ایسا رخ اختیار کرتے گئے کہ آخر میں یہ معاہدہ ہوگیا۔اس معاہدہ کے آغاز سے متعلق امام بیہقیؒ نے امام زہریؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں کے اوپر مشرکین کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا،اس کے باوجود اسلام کی قوت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی تو قریش کے لوگوں نے (نعوذ باللہ) علانیہ رسول اللہ ﷺ کے قتل کا ارادہ کرلیا۔ ابو طالب کو مشرکین کے اس اعلان واظہار سے تشویش ہوئی تو انہوں نے بنی عبدالمطلب اور بنی ہاشم کو جمع کر کے ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو لے کر شعب میں داخل ہو جائیں ۔اس کام میں بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے مسلم و کافر سب نے ان کا ساتھ دیا اور وہ لوگ آپؐ کی حفاظت کی غرض سے شعب میں چلے گئے۔

جب قریش کے لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے خاندان کی حمایت اور تحفظ حاصل ہے،اب انہیں نقصان پہنچانے کی کوئی سبیل نہیں ہے تو انہوں نے خیف بنی کنانہ میں جمع ہوکر ایک معاہدہ کیا،جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں ۔اس معاہدہ کی رو سے انہوں نے بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کا سماجی اور معاشی مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا۔[۲۰]

واقعہ کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعب ابی طالب دراصل ایک پناہ گاہ تھی، جہاں بنی ہاشم رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے خود پناہ گزیں ہو گئے تھے۔مقاطعہ کا معاہدہ قریش نے اس کے بعد لکھا تھا۔موسیٰ بن عقبہؒ کی روایت اس مسئلے میں فیصلہ کن ہے۔ وہ امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں:

> ”پھر جب مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی سختی بہت بڑھ گئی،مسلمان بھی اس سے پریشان ہوگئے (لیکن دین پر جمے رہے) تو مشرکین جمع ہوئے اور انھوں نے کھلّم کھلاّ یہ کہنا شروع کردیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) شہید کردیں گے۔ ابوطالب نے قوم کا یہ انداز دیکھ کر بنی عبدالمطلب کو جمع کیا اور ان سے کہا :”تم لوگ محمد (ﷺ) کو لے کر شعب میں چلے جاؤ اور ان کو شہید کرنے کی کوشش کرنے والوں کا مقابلہ کرو۔“ بنو ہاشم کے اور بنو مطلب کے مسلم و کافر سب نے اس بات کو مان لیا، کچھ نے خاندانی حمیت میں اور کچھ نے

ایمانی غیرت میں۔ جب قریش کو یہ احساس ہو گیا کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو نہیں چھوڑیں گے تو ان کے مشرکین نے اس بات پر اتفاق رائے کیا کہ اب بنو ہاشم کا مقاطعہ کریں گے، یعنی نہ ان کے ساتھ بیٹھیں گے ، نہ ان کے ساتھ لین دین رکھیں گے، نہ ان کے گھر جائیں گے اور جب تک یہ محمد (ﷺ) کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے اس وقت تک ان کے ساتھ کوئی نرمی اور رحم دلی نہیں برتی جائے گی۔[۲۱]

اوپر مذکور دونوں روایات امام زہریؒ کی ہیں اور ان کو تاریخ و سیرت کے اماموں نے قبول کیا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ بخاری ومسلم اور صحاح میں جو روایات ہیں، ان کے بعد اس سلسلے کی سب سے مستند روایات یہی ہیں۔

مقاطعہ کے اسباب

بنو ہاشم اور بنو مطلب کا یہ مقاطعہ اچانک نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ ایک طویل سلسلۂ واقعات ہے، جس کے ضمن میں حالات یہ رخ اختیار کرتے گئے۔ یعنی ایک ایک کر کے واقعات پیش آرہے تھے اور ان پر مشرکین کا ردِّعمل بھی سامنے آرہا تھا۔ جب کئی اسباب جمع ہو گئے تو مشرکین کا ردِّعمل بھی شدید ہو گیا اور نوبت اس مقاطعے تک آ گئی۔ سیرت نگاروں نے اپنے اپنے طور پر مقاطعہ کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، اگرچہ بنیادی باتیں ایک جیسی ہیں، تاہم مختلف لوگوں کے اظہار بیان اور تعدادِ اسباب میں فرق ہے۔ ابن سعد نے کئی راویات کو جمع کر کے لکھا ہے: ”جب قریش کو نجاشی کے رویے کی خبر ملی اور اس کے دربار میں حضرت جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کے احترام و اکرام کا پتہ چلا تو ان کو بہت شاق گزرا۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ جب بنو ہاشم نے ان کی مخالفت کی اور رسول اللہ ﷺ کو لے کر شعب میں چلے گئے تو انھوں نے بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا اور بنو ہاشم کو شعب میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔[۲۲]

نویری نے بھی مقاطعہ کے کئی اسباب بیان کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو ایک دوسرے ملک (حبشہ) میں امن و اطمینان نصیب ہو گیا، نجاشی نے ان کا اکرام کیا اور ان کی حفاظت

کی، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ اسلام لے آئے اور عرب کے دیگر قبائل میں بھی اسلام لگا تار پھیلنے لگا تب ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ معاہدہ کیا اور اس کو کعبہ میں آویزاں کر دیا۔[۲۳]

قسطلانی نے مسلمانوں کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی غایت درجہ عزت و تکریم، حضرت عمرؓ کے اسلام، حبشہ میں مسلمانوں کی عزت اور عرب کے دیگر قبائل میں اسلام کی اشاعت کو بنیادی اسباب بتا کر لکھا ہے کہ ان کی وجہ سے مشرکین نے ناراض ہو کر رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کی اطلاع ابو طالب کو ہوئی تو وہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو جمع کر کے اس شعب میں پناہ گزیں ہو گئے۔ جب مشرکین نے دیکھا کہ ان کی چال نہیں چلی تو اس کے بعد مذکورہ معاہدہ لکھا گیا۔[۲۴]

ابن اسحاق کی روایت میں مزید یہ لکھا ہے کہ قریش نے یکے بعد دیگرے دو وفود ابو طالب کے پاس بھیجے تھے، مگر وہ ناکام رہے تو مشرکین نے غصہ میں آ کر مسلمانوں کو گلی کوچوں میں مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کی حوالگی کا مطالبہ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے بائیکاٹ کا معاہدہ لکھ کر کعبہ میں آویزاں کر دیا۔ جناب ابو طالب نے کعبہ کے پاس جا کر ان کے لیے بد دعا کی اور ان کو صلہ رحمی کا واسطہ دیا، لیکن انھوں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک آپ محمد [ﷺ] کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے اس وقت تک ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی صلح نہیں ہے۔ اس کے بعد ابو طالب مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ کے حامی مشرکین کو ساتھ لے کر شعب میں چلے گئے، اس میں ابولہب نے اپنے خاندان کا ساتھ نہیں دیا۔ اسی دوران میں نجاشی کے دربار میں قریش کی سفارت کی ناکامی کی خبر پہنچی۔ اس پر مشرکین اور مشتعل ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں پر مزید ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان پر ان کی سختیاں اور بڑھ گئیں۔ گلی کوچوں میں مسلمانوں کو زدوکوب کیا جانے لگا اور ان کے لیے اشیائے خرید و فروخت پر پابندی لگا دی گئی اور بنو ہاشم کو پوری طرح الگ تھلگ کر دیا گیا۔[۲۵]

ابن اسحاق نے اگرچہ حبشہ میں مسلمانوں کے استقلال کو اس مقاطعہ کی ایک اہم وجہ تسلیم کیا ہے، تاہم ان کی روایت سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقاطعہ اچانک

نہیں ہوا تھا، بلکہ تدریجاً اپنی انتہا کو پہنچا تھا۔

امام طبریؒ نے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ نجاشی کے ذریعے مسلمانوں کی حمایت اور مشرکین سے ترک تعلق کو اس مقاطعہ کی بنیادی وجہ لکھا ہے۔[۲۶]

انساب الاشراف میں ہے کہ جب حبشہ میں عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ المخزومی کی سفارت ناکام ہوگئی اور نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کے نبی ہونے کی تصدیق کی اور مسلمان ہوگئے تو اہل شعب کے خلاف ان کا غصہ اور نفرت بھڑک اٹھی اور انھوں نے جمع ہو کر دستاویز لکھی۔[۲۷]

مذکورہ بالا روایات کو اگر منطقی اور تاریخی ترتیب سے بیان کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پہلے مشرکین نے خود رسول اللہ ﷺ کو دعوت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب آپ نہیں رکے تو لالچ دے کر آپ کو اس سے روکنا چاہا۔ اس میں ناکامی کے بعد انھوں نے ابو طالب کا درکھٹکھٹایا اور آخر میں یہ کوشش کی بنو ہاشم اور بنو مطلب آپؐ سے الگ ہوجائیں۔ لیکن وہ آپؐ کی حمایت پر جمے رہے۔ مشرکین کے ظلم وستم سے تنگ آکر کچھ مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، جہاں ان کو امن نصیب ہوا اور ان کو واپس لانے کے لیے جو مشرکین وہاں گئے تھے وہ وہاں ناکام اور رسوا ہوگئے۔ اس کے بعد یا اسی دوران میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا تو ابوطالب نے شعب میں پناہ لے لی۔ اسی دوران میں حبشہ کی سفارت کے ناکام لوٹنے کی خبر ملی تو مشرکین نے مقاطعہ کا معاہدہ لکھا اور اسے کعبہ میں آویزاں کردیا۔

ان روایات سے دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں: ایک یہ کہ شعب ابی طالب دراصل مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ تھی، جہاں بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب اپنے آپ کو زیادہ محفوظ تصور کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی غرض سے وہ لوگ اس گھاٹی میں خود محصور ہوئے تھے، ان کو کسی نے دھکیل کر اس میں بند نہیں کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ مقاطعہ کا معاہدہ یا صحیفہ کسی منصوبہ بندی کا حصہ نہیں تھا، بلکہ مشرکین کا ارادہ تو

رسول اللہ ﷺ کو نقصان پہنچانے کا تھا۔ بنو ہاشم نے حضور کی حفاظت کا بندوبست کرلیا تو کوئی راہ نہ دیکھ کر دشمنوں نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

واقعات کے اس تسلسل میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ قریش کے بہت سے با اثر لوگ اس مقاطعہ کے حق میں نہیں تھے، بس فوری اشتعال یا عوامی دباؤ میں سب کے ساتھ ہوگئے تھے۔ چنانچہ جب اس معاہدہ کو ختم کیا گیا تو متعدد لوگوں نے اس کا اظہار کیا کہ ہم اس صحیفہ کے حق میں پہلے بھی نہیں تھے اور اس میں ہماری مرضی شامل نہیں تھی، یعنی ہم فوری دباؤ کی وجہ سے اس میں شریک ہوگئے تھے، پہلے سے اس کی کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ ابن اسحاق نے متعدد لوگوں کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے، لیکن حالات کے دباؤ میں انھوں نے اس مقاطعہ پر دستخط کیے تھے۔ مثلاً ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ ابوجہل نے زمعہ بن اسود کو اس دستاویز کے بارے میں جھوٹا کہا تو زمعہ نے پلٹ کر جواب دیا: ''تم سب سے بڑے جھوٹے ہو۔ جب یہ تحریر لکھی گئی ہم اس وقت بھی اس پر راضی نہیں تھے۔'' ابوالبختری نے کہا: ''زمعہ سچ کہتا ہے۔ اس دستاویز میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، ہم اس پر راضی نہیں ہیں اور نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔'' مطعم بن عدی نے تائیداً کہا: ''تم دونوں سچ کہتے ہو، جھوٹا وہ ہے جو اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے۔ ہم اللہ کے حضور اس دستاویز سے اور اس میں تحریر کردہ مضمون سے برأت کا اعلان کرتے ہیں۔''[۲۸]

قریش کے ان تین بڑے سرداروں کا اعتراف کہ وہ اس مقاطعہ کے حق میں نہیں تھے، لیکن انھوں نے دباؤ میں اس کو قبول کیا تھا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مقاطعہ کسی ردِّعمل کا نتیجہ تھا۔ قوی امکان ہے کہ ایسے کچھ اور لوگ بھی رہے ہوں گے۔

شعب ابی طالب میں پناہ گزینی جناب ابو طالب کی حکمت عملی تھی، جس کی وجہ سے دشمنوں کی سازش ناکام ہوگئی۔ لیکن یہ کام ابو طالب کے لیے بہت آسان نہیں تھا۔ یہ سارے قریش کا مقابلہ کرنے کے مترادف تھا اور انہوں نے کیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط حمایت کی۔ وہ آپؐ کی حفاظت کے لیے کوہ گراں کی طرح ڈٹ کر کھڑے ہو

گئے۔انھوں نے مقاطعہ ختم کرانے کی تو ہر ممکن کوشش کی، لیکن رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔اس موقع پر انھوں نے بعض قصائد بھی کہے تھے،جن میں ایک طرف ان حالات کا بیان ہے،جن سے وہ دوچار تھے، دوسری طرف ان کا قصیدۂ لامیہ عربی زبان وادب کا بھی شاہ کار ہے۔

شعب میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا طریقہ

بنو ہاشم نے شعب کے اندر اس لیے پناہ لی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرسکیں۔لیکن یہ ایک کھلی جگہ تھی، یعنی بے درو دیوار کا ایک قلعہ تھا،جس میں ہر طرف راستے کھلے ہوئے تھے۔چوں کہ یہ شعب نشیبی علاقے میں تھی اس لیے اوپر سے اسے دیکھا جاسکتا تھا۔اس بنا پر ہر وقت اس کا خطرہ تھا کہ دن کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی جگہ کو کوئی نا ہنجار تاک لے، پھر رات کے اندھیرے میں حملہ کردے۔اس لیے آپؐ کی حفاظت کے لیے جناب ابوطالب مستقل فکر مند رہتے تھے اور روزانہ آپؐ کی حفاظت کی نگرانی خود کیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا (جیسا کہ بیہقی اور دوسرے سیرت نگاروں نے لکھا ہے) کہ جب سب لوگ سوجاتے تو رسول اللہ ﷺ کو بیدار کرکے ان کو دوسرے بستر پر سلا دیتے اور آپؐ کے بستر پر کسی اور کو سلا دیتے تھے۔۲۹ اس کا مقصد یہی تھا کہ کوئی رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر کسی گستاخی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے۔

جناب ابو طالب کے اس طرزِ عمل سے سمجھا جا سکتا ہے کہ شعب کے اندر بھی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے کوشش کرنی ہوتی تھی۔لیکن ایک بات ملحوظ رہے کہ ایسا کچھ عرصہ تک ہوا تھا۔ بعد میں حالات اتنے شدید نہیں رہے اور رسول اللہ کبھی کبھی شعب سے باہر بھی آتے تھے اور حرم پاک میں بھی تشریف لے جاتے تھے،جیسا کہ اس مقالے میں مختلف مقامات پر اس کی طرف سے اشارے ہیں۔تاہم بنی ہاشم کا مقاطعہ جاری رہا۔

مقاطعے کی عبارت

مقاطعہ کی اس دستاویز کے الفاظ مختلف روایات میں مختلف آئے ہیں۔ امام

بخاری نے اپنی صحیح میں ضمنی طور پر اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے،لیکن تفصیل نہیں لکھی، البتہ سیرت کی دیگر کتابوں میں اس کے الفاظ موجود ہیں۔ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ میں ابن اسحاق،ابن سعد، ابن ہشام اور طبرانی وغیرہ کے حوالے سے اس مقاطعہ کی خبر اس طرح لکھی ہے:

با سمک اللهم. علی بنی هاشم و بنی المطلب. علی الاینکحوا الیهم ولاینکحوهم ولا یبیعوهم شیئاً ولا یبتاعوا منهم ولا یعاملوهم حتی یدفعوا الیهم محمدا فیقتلوه.[۳۰]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی اس عبارت میں مقاطعہ کے معاہدہ کی خبر تو موجود ہے، لیکن بظاہر معاہد ہ کے الفاظ صرف اتنے نہ رہے ہوں گے، اس لیے کہ وہ باضابطہ دستاویزی تحریر تھی ۔ اس کے لیے سیرت و تاریخ کی کتابوں میں لفظ 'صحیفہ' استعمال ہوا ہے۔لیکن سیرت نگاروں نے عام طور پر اس دستاویز کے لکھے جانے کی خبر ہی دی ہے، اس کی مکمل عبارت کسی نے نقل نہیں کی۔ اسی لیے مختلف کتابوں میں اس کے الفاظ میں فرق ہے اوراس کے بیان میں عام طور پر سیرت نگاروں نے بیانیہ اور اخباری و اطلاعی انداز اختیار کیا ہے۔مثلاً ابن سعد نے لکھا ہے:

"وکتبوا کتاباً علی بنی هاشم ان لاینا کحوهم ولا یبایعوهم ولا یخالطوهم."[۳۱]

بیہقی کے الفاظ ہیں:

"وکتبوا فی مکرهم صحیفة و دارموثیق لایقبلوا من بنی هاشم ابداً صلحا ولا تأخذهم به رأفة حتی یسلموا رسول الله للقتل."[۳۲]

نویری نے لکھا:

اجتمعوا وأتمروا ان یکتبوا کتابا یتعاقدون فیه علی بنی هاشم و بنی عبدالمطلب علی الاینکحوا الیهم ولا ینکحوهم ولا یبیعوهم شیئاً ولایبتاعوا منهم."[۳۳]

مقریزی کے الفاظ یہ ہیں:

”ان لا ینا کحو بنی ھاشم و بنی عبدالمطلب ولا یبایعوھم ولایکلوھم و یجالسوھم.“ ۳۴؎

اس سے ملتے جلتے الفاظ دیگر کتابوں میں بھی ہیں۔ یہ سب الفاظ اس معاہدہ کی خبر یا اطلاع ہیں کہ اس معاہدہ میں کیا تھا۔ نویری اور بعض دیگر سیرت نگاروں نے ایک اور لفظ کا اضافہ کیا ہے: وقطعوا عنھم المیرۃ والمادہ ۳۵؎۔ اس کا مطلب ہے کھانا پانی بند کر دینا۔ ابن عباس کی روایت میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ بظاہر یہ لفظ معاہدہ کا حصہ نہیں ہوگا، بلکہ یہ اس معاہدہ کی خبر اور اس کا موضوع ہے۔

معاہدہ کے جو الفاظ بھی کتابوں میں وارد ہوئے ہیں وہ اصل معاہدہ نہیں ہے، بلکہ اس کی خبر اور اطلاع ہے۔ اس لیے سب کا اسلوب بیانیہ اور اخباری نوعیت کا ہے۔ البتہ چھٹی صدی ہجری کے ایک جید عالم اسماعیل بن محمد بن الفضل التیمی الاصفہانی نے کتاب المبعث والمغازی کے نام سے سیرت طیبہ پر ایک عمدہ کتاب لکھی ہے، جس میں انھوں نے اس معاہدہ کی عبارت کو دستاویز کی طرح لکھا ہے۔ الفاظ ان کے بھی تقریباً وہی ہیں جو مختلف کتابوں میں درج ہوئے ہیں، لیکن ان کا اسلوب ایسا ہے جیسے انھوں نے یہ عبارت دستاویز سے نقل کی ہو۔ ان کی عبارت یہ ہے:

باسمک اللھم: ھذا ما تمالأعلیہ الملأمن قریش، ان لاینکحوا بنی ھاشمو بنی عبدالمطلب ولا ینکحوا الیھم، ولا یبایعوھم ولا یبتاعوا منھم، ولا یخالطوھم ولا یجامعوھم ولا یکلموھم ولا ینصروھم ولا یدوھم ولا یعقلون عنھم ولا یطلُبون بھم ولایطلَبون ولا یترکونھم ینتفعون بشئی من المنافع فی اراضیھم حتی یبرؤوا الیھم من صاحبھم. ۳۶؎

یہاں فطری طور پر ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اسمٰعیل بن محمد اصفہانی کو اس معاہدہ کی یہ دستاویز اتنے زمانے کے بعد کہاں سے ملی، لیکن اس میں کچھ استبعاد نہیں ہے،

اس لیے کہ اس دستاویز کا ایک نسخہ مکہ کے ایک شیخ کے پاس تھا[۳۷]۔ اسی طرح اس کا ایک نسخہ ہشام بن عمرو کے پاس بھی تھا، جیسا کہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے (و هشام بن عمرو، و كانت الصحيفة عنده و هو من بني عامر)[۳۸]۔ اور بھی کئی نسخے اس دستاویز کے موجود تھے، جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اس کا امکان ہے ان میں سے کوئی نسخہ کسی کے ہاتھ لگا اور اس نے اپنی کتاب میں درج کیا ہو اور وہاں سے کوئی نسخہ اسماعیل بن محمد کو دست یاب ہو گیا ہو۔

مقاطعے کی دستاویز کا کاتب

مقاطعہ کی اس دستاویز کے کاتب کے بارے میں راویوں کا اختلاف ہے۔ زیادہ تر روایات میں اس کا کاتب منصور بن عکرمہ بن عامر بن ہاشم کو بتایا گیا ہے[۳۹]۔ ابن ہشام نے نضر بن حارث کا نام بھی لیا ہے۔ ابن اسحٰق نے عکرمہ بن ہاشم بن عبد مناف کا نام لکھا ہے، لیکن یہ بظاہر منصور بن عکرمہ کی تصحیف معلوم ہوتا ہے[۴۰]۔ مواہب لدنیہ میں تین ناموں کا ذکر ہے، جن میں سے ایک ہشام بن عمرو بن حارث ہے۔ باقی دو نام انھوں نے لفظ 'قیل' سے بیان کیے ہیں، یعنی ان کی استنادی حیثیت کم زور ہے۔ وہ نام ہیں: طلحہ بن ابی طلحہ اور منصور بن شرجیل۔ زادالمعاد میں بغیض بن عامر بن ہاشم کا نام ہے۔ اسی طرح بلاذری نے بھی کلبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس صحیفہ کا کاتب بغیض بن عامر بن ہاشم تھا۔ اس نے جس دن یہ معاہدہ لکھا اسی دن اس کی انگلیاں شل ہو گئیں تھی۔[۴۱]

کاتب صحیفہ کے سلسلے میں تمام مراجع میں یہ بات مذکور ہے کہ اس کو رسول اللہ ﷺ نے بد دعا کی تھی، جس کی وجہ سے اس کی انگلیاں شل ہو گئیں تھیں، وہ ان کو حرکت بھی نہیں دے پاتا تھا۔[۴۲]

عیون الاثر میں ہے کہ اس دستاویز کے کاتب ہشام بن عمرو تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس معاہدہ کو ختم کرانے کی کوشش کرنے والوں میں بھی ان کا نام ملتا ہے۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئے تھے۔[۴۳]

کاتب کے نام میں اختلاف کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں: ایک تو یہ کہ اس دستاویز پر کئی لوگوں نے دستخط کیے تھے۔ ممکن ہے، کسی راوی نے دستخط کرنے والوں کو ہی کاتب

کے طور پر ذکر کر دیا ہو۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس دستاویز کے کئی نسخے تیار کرائے گئے تھے اور ان کو الگ الگ جگہوں پر رکھا گیا تھا۔اس لیے اس دستاویز کے کئی کاتب رہے ہوں گے۔سبل الھدی والرشاد میں یہی تاویل بیان کی گئی ہے۔[۴۴]

معاہدہ کی تصدیق

قریش اور بنو کنانۃ کے جولوگ خیف بنی کنانۃ میں جمع تھے انھوں نے اجتماعی طور پر یہ معاہدہ کیا تھا، لیکن کچھ لوگ حالات اور لوگوں کے دباؤ کی وجہ سے اس میں شریک ہوئے تھے، وہ دل سے اس کے حامی نہیں تھے۔غالبًا قریش کواس کا اندازہ تھا، اس لیے انھوں نے اس معاہدہ پر تین سرداروں کی مہر تصدیق بھی ثبت کرائی تھی،تا کہ بعد میں کوئی انکار نہ کردے۔ابن سعد اور مقریزی نے لکھا ہے کہ اس صحیفہ پر تین لوگوں نے مہر لگائی تھی:

ختموا علیه ثلاثة ختام۔[۴۵]

دستاویز کے نسخے

مختلف مراجع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دستاویز کعبے میں آویزاں کرنے کے لیےلکھی گئی تھی، لیکن اس کے کچھ اور نسخے بھی تیار کرائے گئے تھے۔اس کے کم ازکم پانچ نسخوں کا تذکرہ مختلف مراجع میں ملتا ہے۔

صحیفہ رکھنے کی جگہ

زیادہ تر مراجع میں درج ہے کہ یہ صحیفہ ’جوفِ کعبہ‘ یا ’سقفِ کعبہ‘ میں آویزاں کیا گیا تھا[۴۶]۔لیکن کچھ اور لوگوں کے پاس بھی اس کے نسخے ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔جیسے ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ صحیفہ ابو جہل کی خالہ ام الجلاس مخربہ الحنظلیۃ کے پاس تھا[۴۷]۔موسی بن عقبہ کی روایت کے مطابق ہشام بن عبدالعزی کے پاس تھا[۴۸]۔ ابن سعد نے ایک روایت بیان کی ہے جس کے آخری راوی جابر کہتے ہیں کہ مکہ کے ایک شیخ نے ان کو بتایا کہ ان کے دادا کے پاس وہ صحیفہ تھا۔[۴۹]

بلاذری نے ایک روایت میں تو وہی مشہور بات لکھی ہے کہ وہ صحیفہ کعبے میں

تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے اور بھی کئی اقوال لکھے ہیں جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ وہ صحیفہ کعبہ میں نہیں، بلکہ طعیمہ بن عدی کے پاس تھا۔۵۰؎ باقی ابوجہل کی خالہ کا نام سبھی لکھتے ہیں۔مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دستاویز کے کم از کم پانچ نسخے تھے جو مختلف لوگوں کے پاس تھے۔لیکن ظاہر ہے قانونی حیثیت صرف اس نسخے کی تھی جو کعبہ میں آویزاں کیا گیا تھا۔بعد میں جب اس کو دیمک کھا گئی تو اس کی قانونی حیثیت ختم ہوگئی۔

مقاطعہ میں شامل لوگ

سماجی اور معاشی مقاطعہ کے اس معاہدہ میں سارے عرب شامل نہیں تھے، بلکہ قریش کے علاوہ صرف بنو کنانہ اس میں شامل ہوئے تھے۔بنو کنانہ کو احباش بھی کہا جاتا تھا۔انھوں نے بھی اس مقاطعہ میں قریش کا ساتھ دیا تھا۔ان کے علاوہ عرب کے دیگر قبائل اور خاندانوں نے اس میں حصہ نہیں لیا تھا، وہ اصولی طور پر مسلمانوں سے لین دین کر سکتے تھے اور بعض کرتے بھی تھے۔لیکن قریش کے چند لوگوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ مسلمانوں کو اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

سیرت نگاروں نے عموماً لکھا ہے کہ شعب میں صرف بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب ہی محصور ہوئے تھے۔لیکن ابن اسحاق کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوسرے لوگ بھی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی غرض سے شعب میں آ گئے تھے۔ابن اسحاق کے الفاظ ہیں: ''ثم عمد ابو طالب فادخل الشعب ابن اخیه و بنی ابیه و من اتبعهم من بین مؤمن دخل لنصرة الله و نصرة رسول الله و من بین مشرک یحمی فدخلوا شعبهم ۵۱؎۔ عام طور پر سیرت نگاروں نے اس سے بنو ہاشم و بنو عبدالمطلب کے مومن و کافر کو مراد لیا ہے، لیکن شعب کے محصورین میں ایک نام حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا ہے، جو بنی زہرہ سے تعلق رکھتے تھے۔وہ ہاشمی تھے نہ مطلبی، لیکن وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنے تعلقِ خاطر کی وجہ سے شعب ابی طالب میں مقیم ہو گئے تھے۔اسی طرح ابو سلمہ المخزومیؓ بھی اسی شعب میں جناب ابو طالب کی جوار میں رہتے تھے۔ممکن ہے کہ ایسے کچھ اور مسلمان بھی اس شعب میں چلے گئے ہوں۔بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے علاوہ

دیگر خاندانوں میں بھی بہت سے مسلمان تھے، لیکن اس معاہدہ میں وہ لوگ شامل نہیں تھے۔قریش اصولی طور پر ان کو روک بھی نہیں سکتے تھے۔

بنو ہاشم جب شعب میں گئے تو ان میں سے صرف ابولہب کا نام آتا ہے جس نے مشرکین کا ساتھ دیا تھا۔لیکن کتب سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ بنو ہاشم کے کچھ اور لوگ بھی تھے، جنھوں نے اس معاملے میں قریش کی ہم نوائی کی تھی۔مثلاً دستاویز کے کاتبوں میں ایک نام منصور بن عکرمہ بن عامر بن ہاشم کا ہے۔۵۲ ان کا تعلق بنی ہاشم سے تھا، ابولہب کے بیٹوں کے بارے میں بھی ایک رائے یہی ہے کہ وہ شعب کے اندر نہیں تھے۔

شعب ابی طالب میں محصوری کی مدت

سیرت نگاروں نے شعب ابی طالب میں پناہ گزینی کی مدت عام طور پر تین برس لکھی ہے۔بعض سیرت نگاروں نے ضعیف قول کے طور پر دو برس کا بھی ذکر کیا ہے۔ تمام مراجع کا جائزہ لینے سے پہلا قول ہی مستند معلوم ہوتا ہے۔اس لیے کہ وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ مقاطعہ کا آغاز یکم محرم الحرام سال نبوت سات (۷) میں ہوا تھا۔۵۳ اسی طرح اکثر مراجع میں اس کے خاتمہ کی تاریخ سال نبوت دس (۱۰) لکھی ہے۔۵۴ چوں کہ سیرت نگاروں نے اس واقعہ کی زیادہ سے زیادہ مدت تین سال لکھی ہے، اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ دس (۱۰) سال نبوت کے شروع میں یہ مقاطعہ ختم ہوا تھا۔

(باقی)

حواشی و مراجع

۱۔ ابن سیدالناس: عیون الاثر فی فنون المغازی و الشمائل والسیر، تحقیق محمد العید الخطر اوی اور محی الدین متو، مکتبہ دار التراث، مدینۃ، دار ابن کثیر بیروت، بدون سنہ، ص ۱/۲۲۲

۲۔ ابن عبدالبر: الدرر فی اختصار المغازی والسیر، تحقیق، الدکتور شوقی ضیف، دار المعارف قاہرہ، طبع دوم، بدون سنہ ص ۵۳

۳۔ صحیح البخاری، کتاب الحج، حدیث نمبر: ۱۵۹۰

۴۔ صحیح مسلم: حدیث نمبر ۱۳۱۴، ریاض، طبع اول ۱۹۹۸

۵۔ ابوداؤد: حدیث نمبر ۲۰۱۰

۶۔ فتح الباری، ابواب المبعث، جلد ۱۱ص: ۳۶۴
۷۔ بلاذری، احمد بن یحی: جمل من انساب الاشراف، تحقیق، الدکتور حسین زکار اور الدکتور ریاض زرکلی، دارالفکر، بیروت لبنان، طبع اول ۱۹۹۶، جلد اول، ص: ۲۷۰
۸۔ محمد بن عبد اللہ غبان الصبحی: مرویات الوثائق المکتوبہ من النبی والیہ جمعا دراستہ، جامعہ اسلامیہ مدینۃ منورہ، طبع اول، ۲۰۰۹، صفحات ۱۴۶ تا ۱۶۴
۹۔ ازرقی، ابوالولید محمد بن عبد اللہ بن احمد: اخبار مکہ وما جاء فیہا من الآثار، تحقیق دکتور عبدالملک بن عبداللہ بن دھیش، مکتبہ اسدی، طبع اول ۲۰۰۳، ص: ۸۴۳
۱۰۔ ازرقی ص: ۸۴۰
۱۱۔ حوالہ سابق، ص: ۸۵۸
۱۲۔ ابو عبداللہ محمد بن اسحاق: اخبار مکہ فی قدیم الدھر و حدیثہ، تحقیق عبدالملک بن عبداللہ بن دھیش، دار حضر، بیروت، لبنان، طبع دوم، ۱۹۹۴، جلد ۳، ص ۲۶۴
۱۳۔ الفاکہی جلد ۳، ص ۲۶۷
۱۴۔ حوالہ سابق جلد ۳، ص ۲۶۴
۱۵۔ صحیح البخاری حدیث نمبر ۱۵۸۸
۱۶۔ الفاکہی جلد ۳، ص ۲۶۹
۱۷۔ جلد ۳، ص ۲۶۴
۱۸۔ الفاکہی، جلد ۳، ص ۲۶۹
۱۹۔ ابن اسحاق، کتاب السیر والمغازی، تحقیق الدکتور سہیل زکار، دارالفکر طبع اول ۱۹۸۷، ص ۱۵۹
۲۰۔ بیہقی: دلائل النبوۃ، تحقیق الدکتور عبدالمعطی قلعجی، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان، طبع اور ۱۹۸۸، السفر الثانی، ص ۳۱۱
۲۱۔ موسی بن عقبہ: المغازی، جمع و تحقیق، محمد باقشیش ابو مالک، ص ۸۱-۸۲
۲۲۔ ابن سعد، محمد بن منیع بن سعد: الطبقات الکبری، تحقیق الدکتور علی محمد عمر، مکتبہ خانجی، قاہرہ، طبع اول، ۲۰۰۱، جلد ۱، ص ۸-۱۷۷
۲۳۔ النویری، شہاب الدین احمد بن عبدالوھاب: نہایۃ الارب فی فنون الادب، تحقیق الاستاد علی محمد ھاشم، دالرالکتب العلمیہ بیروت، لبنان، طبع اول ۲۰۰۴، ص ۳/۱۶-۱۸۲
۲۴۔ القسطلانی، احمد بن محمد: المواھب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ، تحقیق صالح احمد الشامی، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع دوم ۲۰۰۴، ص ۱/۲۴۷
۲۵۔ ابن اسحاق ۱۹۸-۲۰۱

۲۶۔ الطبری،ابوجعفر محمد بن جریر: تاریخ الرسل والملوک، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف، مصر، طبع دوم، ۱۹۶۸ جلد نمبر ۲، ص ۳۳۵
۲۷۔ الانساب، جلد ا ص ۲۷۰
۲۸۔ ابن اسحاق، ابن هشام: السیرۃ النبویۃ، تحقیق، عمر عبدالسلام التدمری، دارالکتاب العربی، طبع سوم ۱۹۹۰، جلد ۲، ص ۲۹
۲۹۔حوالہ سابق
۳۰۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ: الوثائق السیاسیۃ، دارالنفائس، بیروت، طبع ہفتم، ۱۹۸۷، ص ۴۴ ۳۱۔ابن سعد ۱/۱۷۸
۳۲۔ دلائل النبوۃ، جلد اول، ص ۲۷۳ ۳۳۔نہایۃ الارب ۱۸۳/۱۶
۳۴۔ المقریزی: تقی الدین احمد بن علی: امتاع الاسماع، تحقیق محمد عبدالحمید النمیسی، دارالکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول ۱۹۹۹ جلد ۱، ص: ۴۳
۳۵۔نہایۃ الارب، جلد ۱۶، ص: ۱۸۳
۳۶۔ اسماعیل بن محمد بن الفضل التیمی الاصفہانی: کتاب المبعث والمغازی دارالولید، طرابلس، لیبیا طبع اول ۲۰۱۰، ص ۲۲۹
۳۷۔ طبقات ابن سعد، جلد اول، ص ۱۷۸
۳۸ابن کثیر، جلد ۱، ص ۴۶
۳۹۔ ابن ہشام، جلد ۲، ص: ۵ ۴۰۔السیر والمغازی، ص: ۱۵۶ ۴۱۔بلاذری، ص: ۲۷۱
۴۲۔ ابن سعد ۱/۱۷۸، ابن القیم الجوزیہ: زادالمعاد فی ھدی خیر العباد، تحقیق نبیل بن نصّار السندھی، دارعالم الفوائد، الریاض، طبع اول، ۲۰۱۸، ص ۳/۳۶ ۴۳۔جلد ۱، ص ۲۲۴
۴۴۔ سبل الھدی والرشاد جلد ۲، ص: ۵۰۳
۴۵۔ طبقات ابن سعد، ص ۱/ ۱۸۷) (امتاع الاسماع جلد اول، ص ۴۳
۴۶۔ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۵ ۴۷۔طبقات، جلد ۱، ص ۱۷۸
۴۸۔ امتاع الاسماع، جلد اول، ص ۴۳ ۴۹۔الطبقات الکبری، جلد اول، ص ۱۷۸
۵۰۔ انساب الاشراف، جلد اول، ص ۲۷۱
۵۱۔ السیرۃ، ص ۲۰۱ ۵۲۔ابن ہشام جلد ۲، ص ۵ ۵۳۔نہایۃ الارب، جلد ۱۶، ص ۱۸۳
۵۴۔ ابن سعد، طبقات، جلد ا ص: ۱۷۹، بلاذری انساب، جلد ۲، ص ۲۷۳

زندگی کے عام فقہی مسائل

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ماہ نامہ زندگی نو، نئی دہلی میں فقہی استفسارات، رسائل ومسائل کے کالم میں شائع ہونے والے سوالات وجوابات کا مجموعہ جو انسانی زندگی میں عام طور پر درپیش رہتے ہیں۔ تمام مسائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور علمائے سلف اور فقہاء کرام کی آراء کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اختلافی مسائل میں فقہاء کی آراء، دلائل کے ساتھ اس طرح نقل کی گئی ہیں کہ اس سے قارئین کے ذہنی افق میں کشادگی پیدا ہوگی اور وہ مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہوں گے۔

امید ہے کہ ان مجموعوں سے روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والی بہت سی الجھنوں اور مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔

★ جلد اول	صفحات : 216	قیمت : 170.00
★ جلد دوم	صفحات : 240	قیمت : 150.00
★ جلد سوم	صفحات : 200	قیمت : 100.00
★ جلد چہارم	صفحات : 200	قیمت : 120.00
★ جلد پنجم	صفحات : 208	قیمت : 170.00

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز MMI PUBLISHERS

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Mob: 7290092401, 7290092403

info@mmipublishers.net | mmipublishers@gmail.com mmipublishers.net

احادیثِ احکام کی روایت میں امام ترمذیؒ کا اسلوب

——————— محترمہ صائمہ ملک

ماہرینِ فقہ الحدیث کی فقاہت حتی المقدور احادیث پر قائم کردہ اُن کے تراجمِ ابواب میں پنہاں ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ احادیثِ احکام کے سمندر سے مستنبط ہونے والے احکامِ فقہ کے موتیوں کو عنواناتِ ابواب کی صورت میں پرو دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ بعض مقامات پر اُن روایاتِ احکام کے حدیثی وفقہی پہلوؤں کی مزید صراحت و وضاحت اپنے اقوال و آراء کے ذریعے کرتے ہیں، جس کی وجہ سے حدیث کے فہم و استنباط میں سہولت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس ضمن میں امام ترمذیؒ کی 'سنن' کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ وہ نہ صرف تراجمِ ابواب کے ذریعے احادیث الابواب میں مخفی فقہی احکام کے گوہر منظر پر لائے ہیں، بلکہ اُنھوں نے اُن احادیث کے مختلف حدیثی وفقہی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس مقالہ میں ان کے مختلف اسالیب کا مطالعہ جامع ترمذی: ابواب الطھارۃ تا ابواب الجنائز کی روشنی میں کیا جارہا ہے۔

اجمالِ حدیث کی تشریح

امام ترمذیؒ اپنی تالیف میں اکثر مقامات پر حدیث الباب میں مذکور 'اجمال' کی 'تشریح' کرتے ہوئے فقہی مسئلہ میں متوقع اشکال کو دور کردیتے ہیں۔

مثال کے طور پر انھوں نے یہ حدیث نقل کی ہے: **لاصلوٰۃ بعد الفجر الاسجدتین**[۱] (فجر کے بعد کوئی نماز نہیں، سوائے دو سجدوں کے) کی حدیث میں '**لاصلوٰۃ**' اور '**بعد الفجر**' کے الفاظ مجمل ہیں۔ واضح نہیں ہے کہ یہاں نمازِ فجر کا وقت ختم ہوجانا مراد ہے۔

یانمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد کا ذکر ہو رہا ہے یا آغازِ وقت فجر کا؟اور اس کے بعد 'سجدتین' اپنے حقیقی معنیٰ 'سجدے' میں مستعمل ہے یا 'رکعت' کے مجازی معنیٰ میں؟ اگر مجازی معنی میں وارد ہوا ہے تو کن دو رکعتوں کا ذکر ہو رہا ہے؟ اس اجمال کی تشریح امام ترمذیؒ اپنے قول سے کرتے ہیں:

لاصلوٰۃ بعد طلوع الفجر الارکعتی الفجر.

(طلوعِ فجر کے بعد سوائے دو رکعت فجر کے اور کوئی نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔)

ان کی اس تشریح سے واضح ہوا کہ حدیث مذکور میں 'بعدالفجر' سے مراد 'بعد طلوع الفجر' اور 'سجدتین' سے مراد فجر کی دو رکعتیں ہیں۔اس طرح انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ طلوع فجر کے بعد سوائے فجر کی دو سنتوں کے اور کوئی نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

اسی طرح انھوں نے یہ حدیث روایت کی ہے: لاتصوموا یوم السبت الافیما افترض (اللّٰہ) علیکم[۲] (ہفتے کے دن کا روزہ نہ رکھو، سوائے اس روزے کے جس کو اللہ نے تم پر فرض کیا ہے)۔اس حدیث میں صوم یوم السبت کی ممانعت سے دو معانی کا احتمال پایا جاتا ہے۔ اول یہ کہ رمضان کے علاوہ اس کی ممانعت تخصیص کی صورت میں ہے۔(یعنی روزے کے لیے محض ہفتے کا دن مخصوص کرلیا جائے۔) دوم یہ کہ اس کی ممانعت علی الإطلاق ہے؟ امام ترمذی نے اس حدیث کے ضمن میں لکھا ہے:

ومعنیٰ الکراھیة فی ھذاأن یختصّ الرجل یوم السبت بصیام،لأن الیھود یعظّمون یوم السبت۔[۴]

(کراہت سے مراد یہ ہے کہ آدمی ہفتے کا دن روزہ رکھنے کے لیے خاص کرلے اور وجہِ کراہت یہ ہے کہ یہود ہفتے کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔)

اس طرح انھوں نے یہ کہنا چاہا ہے کہ صوم یوم السبت کی ممانعت تخصیص کی صورت میں ہے۔ اگر اس سے پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھ لیا جائے تو ہفتے کے دن روزہ رکھنے میں کوئی قباحت یا حرج نہیں ہے۔

اقتضاء النص کی تصریح

بعض اوقات امام موصوفؒ استخراجِ مسئلہ میں اپنے قول کے ذریعے تقاضائے نص کی توضیح فرماتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک حدیث حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ویل للأعقاب من النار۔[۵]

(ایڑھیوں کے لیے دوزخ کی آگ سے ہلاکت ہے۔)

اس حدیث سے بطور عبارۃ النص یہ ثابت ہو رہا ہے کہ وضو کرتے ہوئے ایڑھیاں خشک نہیں رہنی چاہئیں۔نبی ﷺ کی یہ وعید' پیروں کے دھوئے جانے' کا تقاضا کررہی ہے۔اس تقاضے کی تکمیل کے بغیر وعید سے بچنا ممکن نہیں ہے۔اگر پیروں پر مسح کیا جائے تو حدیث الباب پر عمل نہیں ہوسکتا۔اِسی اقتضاء النص کو امام ترمذیؒ نے اپنے قول کے ذریعے واضح کیا ہے:

وفقه هذا الحديث: انه لايجوز المسح على القدمين اذالم يكن عليهما خفّان أوجوربان۔[۶]

(اس حدیث سے استنباط ہوتا ہے کہ اگر پیروں پر موزہ یا جراب نہ ہوتو ان پر مسح کرنا جائز نہیں ہے۔)

اقتضاء النص سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں پیروں کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو عبداللہ بن عمروؓ کے طریق پر بیان کرتے ہوئے یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے:"باب غسل الرجلين ولايمسح على القدمين "[۷](اس چیز کا بیان کہ دو پیروں کو دھویا جائے گا،ان پر مسح نہیں کیا جائے گا۔) صحیح مسلم کی حدیث یہ باب قائم کیا گیا ہے:"باب وجوبِ غسل الرجلين بكمالهما "۔[۸] [اس چیز کا بیان کہ دونوں پیروں کو مکمل دھویا جائے گا۔] امام نسائیؒ نے 'باب ایجاب غسل الرجلين' [۹] اور امام ابن ماجہؒ نے 'باب غسل العراقيب '[۱۰] کا عنوان قائم کیا ہے۔امام ابوداؤدؒ نے بھی عبداللہ بن عمروؓ کے طریق پر روایتِ مذکورہ کو بیان کرتے

ہوئے ''باب فی اسباغ الوضوء'' (مکمل وضو کرنے کا بیان) کا عنوان تجویز کیا ہے۔

مولانا محمد عاقل کے نزدیک 'اسباغ' کے معنی 'اکمال' کے ہیں۔[۱۲] قرآن میں بھی اس کے یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان: ۲۰)

(اور اس نے اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں۔)

صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ 'اسباغ' کے معنیٰ 'انقاء' کے ہیں۔[۱۳] یعنی اعضاء کو اچھی طرح دھونا۔

معرفتِ 'غریب الحدیث'

امام ترمذیؒ کبھی احادیث میں مذکور نامانوس الفاظ کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ اس سے کوئی فقہی اشکال رفع ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث ہے:

عن ابن عباس ان رجلا قال: یارسول اللہ ﷺ! إن أمی توفیت أفینفعها ان تصدقت عنها؟ قال: نعم، قال: فأن لی مخرفًا فأشهدك انی قد تصدقت به عنها[۱۴]

(ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ دوں تو کیا اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ اس پر اُس شخص نے عرض کیا: میرا ایک باغ ہے۔ میں آپؐ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے اس کی طرف سے صدقہ کردیا۔)

اس حدیث میں 'مخرفاً' کا لفظ مذکور ہے، جس کے معنیٰ غریب الحدیث کی کتابوں میں 'باغ' بتائے گئے ہیں۔[۱۵] امام ترمذیؒ نے بھی یہی معنیٰ بیان کردیے ہیں:

ان لی مخرفا یعنی بستانا۔[۱۶]

(یعنی حدیث الباب میں مذکور لفظ 'مخرفا' کے معنی باغ کے ہیں۔)

ابواب الحج میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی یہ حدیث آتی ہے:

قال: تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وابوبکر و عمر

وعثمان۔[۱۷]

(ابن عباسؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے تمتع کیا۔)

کتبِ غرائب ولغات میں لفظ 'تمتع' کے معنی ایامِ حج میں عمرے کا فائدہ اٹھانے کے بیان کیے گئے ہیں۔[۱۸] امام ترمذیؒ نے بھی اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ لکھا ہے: 'تمتع' یہی ہے کہ آدمی حج کے مہینوں میں عمرے کا احرام باندھ کر حرم میں داخل ہو جائے۔ عمرے سے فارغ ہونے کے بعد مکہ میں مقیم رہے، پھر حج کرے۔[۱۹]

ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے:

أن النبی ﷺ کان یدّھن بالزیت وھو محرم غیر المقتّت.[۲۰]

(نبی ﷺ حالتِ احرام میں بغیر خوشبو والا تیل لگاتے تھے۔)

اس حدیث میں 'المقتّت' ایک غیر مانوس لفظ ہے۔ کتب غرائب ولغات میں اس کے معنیٰ 'مطیّب' یعنی خوشبودار کے ملتے ہیں۔ اس بنا پر 'غیر المقتت' کے معنیٰ ہوئے بغیر خوشبو کے۔[۲۱] امام ترمذیؒ نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے:

قال ابو عیسیٰ: مقتت: مطیب۔[۲۲]

(ابوعیسیٰ نے کہا کہ مقتّت خوشبودار کو کہتے ہیں۔)

ایک حدیث میں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے:

أن رسول اللہ ﷺ سئل: أی الحج أفضل: قال: "العجّ والثجّ۔[۲۳]

(رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ افضل حج کون سا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: جس میں لبیک پکارنا بہت ہو اور خون بہانا، یعنی قربانی کرنا ہو۔)

'العج'، 'الثج' دونوں غیر مانوس الفاظ ہیں۔ کتبِ لغت میں 'العج' کے معنیٰ، 'رفع الصوت بالتلبیۃ'، (زور سے لبیک کہنا) بیان کیے گئے ہیں۔[۲۴] جب کہ 'الثج' کا معنی ہے 'سیلان دماء الھدی'[۲۵] (ہدی کا خون بہانا)۔ امام ترمذی نے بھی ان الفاظ کی یہی تشریح بیان کی ہے:

والعج: ھو رفع الصوت بالتلبیة والثج: ھو نحر البدن[26]

(عج زور سے لبیک کہنے کو کہتے ہیں، جب کہ 'ثج' سے مراد ہے اونٹ ذبح کرنا۔)

مذکورہ بالا مثالوں میں کتبِ لغات وغرائب کی تشریحات اور امام ترمذیؒ کی توضیحات کے درمیان موافقت اور ہم آہنگی اور معرفتِ غرائب الحدیث میں اُن کی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔

حدیث الباب کی تشریح

امام ترمذیؒ نے بعض وضاحت طلب مقامات پر احادیثِ احکام کی مراد اپنے قول کے ذریعے واضح کی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من أدرک من الصبح رکعةً قبل أن تطلع الشمس فقدأدرک الصبح، ومن أدرک من العصر رکعة قبل أن تغرب الشمس فقد أدرک العصر[27]

(جس نے صبح کی نماز کی ایک رکعت آفتاب نکلنے سے پہلے پڑھ لی، اُس نے صبح کی نماز پڑھ لی اور جس نے عصر کی ایک رکعت آفتاب ڈوبنے سے پہلے پڑھ لی، اس کی نمازِ عصر ادا ہوگئی۔)

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "یہ رخصت صرف صاحبِ عذر کے لیے ہے۔ مثلاً جو شخص سو گیا ہو، یا بھول جائے، پھر جاگے، یا طلوعِ آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت اسے یاد آجائے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی، وہ اُسی وقت نماز پڑھ سکتا ہے۔[28]

امام ترمذیؒ نے ترکیبِ نماز بیان کرتے ہوئے ایک طویل روایت نقل کی ہے۔ اس کا ایک جز درج ذیل ہے:

اذاقام من السجدتین کبّر ورفع یدیه[29]

(جب آپؐ دو (۲) سجدوں کے بعد اُٹھتے تو اللہ اکبر کہتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے۔)

اس روایت میں لفظ 'السجدتین' مذکور ہے۔اس کا واحد 'سجدۃ' ہے۔اس کا حقیقی معنیٰ بارگاہِ الٰہی میں اپنی پیشانی کو زمین پر رکھنا ہے،لیکن اس روایت میں سجدہ اپنے حقیقی معنیٰ میں نہیں، بلکہ مجازی معنیٰ 'رکعت' میں وارد ہوا ہے،اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام ترمذیؒ نے لکھا ہے:

اذاقام من السجدتین، یعنی اذاقام من الرکعتین [۳۰]

(جب وہ دو (۲) سجدوں سے اٹھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب دو رکعت پڑھ کر کھڑا ہو۔)

ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھی أن یصلی الرجل مختصرا [۳۱]

(نبی ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ آدمی کمر پر اپنا ہاتھ رکھ کر نماز پڑھے۔)

اس حدیث میں لفظ 'مختصرا' آیا ہے۔ اختصار فی الصلوٰۃ کے مختلف معانیٰ بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً قرأت کو نماز میں مختصر کرنا، اپنے ہاتھوں میں عصا لے کر اس کا سہارا لینا، نماز میں کمر پر ہاتھ رکھنا' ارکانِ صلوٰۃ یعنی قیام اور رکوع وسجود کو مختصر کرنا، جلدی جلدی مختصر نماز پڑھنا، آیۂ سجدہ ترک کر دینا، وغیرہ۔[۳۲] لیکن امام ترمذیؒ نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے:

الاختصار أن یضع الرجل یدہ علی خاصر تہ فی الصلوٰۃ [۳۳]

(اختصار یہ ہے کہ آدمی نماز میں اپنے ہاتھ کو کمر پر رکھے۔)

معلوم ہوا کہ امام موصوف نے مذکورہ بالا تشریحی اقوال میں سے ایک مرادی معنیٰ متعین فرما کر فقہی مسئلہ کی توضیح کی۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

کانت قریش ومن کان علی دینھا وھم الحمس یقفون بالمزدلفۃ یقولون نحن قطین اللّٰہ، وکان من سواھم یقفون بعرفۃ، فانزل اللّٰہ عزوجل: ثم افیضوا من حیث افاض الناس۔ [البقرۃ:۱۹۹] [۳۴]

(قریش اور جو اُن کے طریق کے پیرو تھے، یعنی حمس، یہ سب مزدلفہ میں قیام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم بیت اللہ کے خادم ہیں اور یہاں کے مکین ہیں۔ اُن کے علاوہ دیگر لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ اس پر اللہ عز وجل نے یہ آیت نازل کی کہ اے قریش! پھرو جہاں سے سب لوگ پھرتے ہیں، یعنی تم بھی عرفات تک جاؤ اور وہاں سے دوسرے لوگوں کے ساتھ لوٹو۔)

یہ حدیث روایت کرنے کے بعد امام ترمذیؒ اس کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مکہ کے لوگ خود کو بیت اللہ کا متولی سمجھتے تھے، چنانچہ وہ حرم سے باہر نہیں جاتے تھے اور چوں کہ عرفات حرم سے باہر ہے، اس لیے حج میں وہ مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، عرفات تک نہیں جاتے تھے، جب کہ ان کے علاوہ دیگر لوگ عرفات تک جا کر وہاں وقوف کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت (البقرۃ: ۱۹۹) نازل فرمائی: ''اہل مکہ کو بھی باقی لوگوں کی طرح عرفات تک جانے کا حکم دیا گیا۔'' ۳۵

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں صرف احادیث روایت کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی تشریحات بھی کی ہیں، ان کے ابہام کی وضاحت کی ہے، نامانوس الفاظ کے معانی بیان کیے ہیں اور فقہی استنباط بھی کیا ہے۔ ان کی یہ خصوصیات انھیں دیگر محدثین سے ممتاز کرتی ہیں۔

حواشی و مراجع

۱۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء لاصلوٰۃ بعد طلوع الفجر الا رکعتین، ۴۱۹

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ابواب الصوم، باب ماجاء فی صوم یوم السبت، ۷۴۴

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء ویل للأعقاب من النار، ۴۱

۶۔ ایضاً

۷۔ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب غسل الرجلین ولا یمسح علی القدمین، ۱۶۳

۸۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب وجوب غسل الرجلین بکمالھا،۲۴۲
۹۔ سنن نسائی، کتاب الطہارۃ، باب ایجاب غسل الرجلین ،۱۱۰
۱۰۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ وسننہا، باب غسل العراقیب،۴۵۳
۱۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی اسباغ الوضوء،۹۷
۱۲۔ محمد عاقل، مولانا، الدرالمنضود علی سنن ابی داؤد، مکتبۃ الشیخ کراچی، ج۱،ص۲۳۲
۱۳۔ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب اسباغ الوضوء،۱۳۹
۱۴۔ جامع ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ماجاء فی الصدقۃ عن المیت،۶۶۹
۱۵۔ ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی، غریب الحدیث، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ج۱، ۱۴۰۵ھ،ص۲۷۴، ابن اثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر، المکتبۃ العلمیۃ، بیروت، ج۲، ۱۳۹۹ھ، ص۲۴، زمخشری، محمود بن عمرو، الفائق فی غریب الحدیث والأثر، دارالمعرفہ، لبنان، ج۱،ص۳۵۹
۱۶۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر:۶۶۹
۱۷۔ ا یضاً، ابواب الحج، باب ماجاء فی التمتع ،۸۲۲
۱۸۔ ابن قتیبۃ، عبداللّٰہ بن مسلم، غریب الحدیث، مطبعۃ العانی، بغداد، ۱۳۹۷ھ، ج۷،ص۲۱۳، ابن اثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر، جلد۴،ص۲۹۲، حموی، احمد بن محمد بن علی، ابوالعباس، المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر، المکتبۃ العلمیۃ، بیروت، ج۲،ص۵۶۲۔ قلعجی، محمد رواس، معجم لغۃ الفقہاء، ج۱،ص۱۴۵
۱۹۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی التمتع ،۸۲۴
۲۰۔ ایضاً، باب ادّہان المحرم بالزیت،۹۶۲
۲۱۔ قاسم بن سلام، ابوعبید، غریب الحدیث، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباددکن، ۱۳۸۴ھ، ج۲،ص۳۲۔ ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی، غریب الحدیث، ج۲،ص۲۱۸۔ ابن منظور، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، دارصادر، بیروت، ج۲، ۱۴۱۴ھ،ص۱۷
۲۲۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ادّہان المحرم بالزیت،۹۶۲
۲۳۔ ایضاً، باب ماجاء فی فضل التلبیۃ والنحر ،۸۲۷
۲۴۔ ابن اثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر، ج۳،ص۸۴۔ الحمیری، نشوان بن سعید، شمس العلوم ودواء کلام العرب من الکلوم، دارالفکر، بیروت: ۱۴۲۰ھ، ج۷،ص۴۳۰۹۔ حموی، احمد بن محمد،

المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر، ج ۲، ص ۳۹۳۔ الانباری، محمد بن القاسم، ابوبکر، الزاہر فی معانی کلمات الناس، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۲ھ، ج ۲، ص ۱۲۰۔ ابراہیم مصطفیٰ وغیرہ، المعجم الوسیط، بغیر ذکر المدینۃ: دارالدعوۃ، س ن، ج ۲، ص ۵۸۴

۲۵۔ الازہری، محمد بن احمد، تہذیب اللغۃ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۱ء، ج ۱، ص ۵۵۔ ابن منظور، علامہ، لسان العرب، ج ۲، ص ۳۱۸۔ حموی، احمد بن محمد، المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر، ج ۱، ص ۸۰۔ احمد مختار، معجم اللغۃ العربیۃ المعاصرۃ، بغیر ذکر المدینۃ: عالم الکتب، ۱۴۲۹ھ، ج ۱، ص ۳۱۳

۲۶۔ جامع ترمذی،، ابواب الحج، باب ماجاء فی فضل التلبیۃ والنحر، ۸۲۸

۲۷۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فیمن ادرک رکعۃ من العصر قبل أن تغرب الشمّس، ۱۸۶

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً، باب منہ، رقم الحدیث ۳۰۴

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً، باب ماجاء فی النہی عن الاختصار فی الصلوٰۃ، ۳۸۳

۳۲۔ بنوری، محمد یوسف، سید، معارف السنن شرح جامع الترمذی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، س ن، ج ۳، ص ۴۲۷۔ انورشاہ کشمیری، العرف الشذی شرح سنن الترمذی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۵ھ، ج ۱، ص ۳۶۴۔ محمد تقی عثمانی، مولانا، درس ترمذی، ج ۲، کراچی: مکتبہ دار العلوم، ۱۴۳۲ھ، ص ۱۲۹۔ منظور احمد، مولانا، فضل المعبود فی شرحہ سنن ابی داوٗد، لاہور: المصباح، ج ۲، ص ۶۲۔ محمد عاقل، مولانا، الدر المنضود علی سنن ابی داوٗد، ج ۲، ص ۳۲۴

۳۳۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی النہی عن الاختصار فی الصلوٰۃ، ۳۸۳

۳۴۔ ایضاً، ابواب الحج، باب ماجاء فی الوقوف بعرفات والدعاء فیہا، ۸۸۴

۳۵۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی الوقوف بعرفات والدعاء فیہا، رقم الحدیث ۸۸۴

بحث ونظر

تفہیم القرآن اور فی ظلال القرآن کا تقابلی مطالعہ

(۲)

ڈاکٹر عظمیٰ خاتون

فقہی مباحث

تفہیم القرآن میں فقہی مسائل پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے، جب کہ اس کی بہ نسبت فی ظلال القرآن میں فقہی مسائل پر گفتگو کرنے سے عموماً پرہیز کیا گیا ہے۔ تفہیم القرآن میں فقہی مسائل پر گفتگو کرتے وقت لغت و بلاغت کی نکتہ آفرینیوں کا پورا خیال رکھا گیا ہے، مفردات قرآن کے اصل عربی مفاہیم متعین کرنے میں لغت کی امہات الکتب وغیرہ سے براہ راست استفادہ کیا گیا ہے اور مختلف ائمہ کی آراء نقل کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ المائدہ، آیت ۵ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے مختلف مسالک بیان کیے ہیں اور نکاح کے مختلف پہلوؤں پر بڑے عالمانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ آیت وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُم ...... میں الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ سے کون مراد ہیں؟ اس سلسلے میں بیان فرماتے ہیں:

> ''اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ نکاح کی اجازت صرف انہی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی ہے کہ وہ محصنات (محفوظ عورتیں) ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ابن عباسؓ کا خیال یہ ہے کہ یہاں اہل

کتاب سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوں۔ رہے دار الحرب اور دار الکفر کے یہود و نصاریٰ تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا درست نہیں۔حنفیہ اس سے تھوڑا اختلاف کرتے ہیں۔ان کے نزدیک بیرونی ممالک کے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا حرام تو نہیں ہے،مگر مکروہ ضرور ہے۔بخلاف اس کے سعید بن المسیبؒ اور حسن بصریؒ اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے،لہٰذا ذمی اور غیر ذمی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔پھر محصنات کے مفہوم میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔حضرت عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد پاک دامن،عصمت مآب عورتیں ہیں اور اس بنا پر وہ اہل کتاب کی آزاد منش عورتوں کو اس اجازت سے خارج قرار دیتے ہیں۔ یہی رائے حسنؒ، شعبیؒ اور ابراہیم نخعیؒ کی ہے اور حنفیہ نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔بخلاف اس کے امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے،یعنی اس سے مراد اہل کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈی نہ ہوں۔''[۱]

یہاں کتابیہ،لونڈی، ہندو عورت اور آتش پرست عورت کے سلسلے میں اسلام کے کیا احکام ہیں؟اس مسئلے پر فقہاءِ کرام کی آراء پیش کی گئی ہیں۔مسئلہ کفاءت،مصارفِ زکوٰۃ میں تالیفِ قلب کے متعلق بھی فقہی مباحث اٹھائے گئے ہیں اور ربا کے متعلق بھی اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔اس تفسیر کا فقہی پہلو بھی نہایت اہم ہے۔اس کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے فقہی مسائل کو توازن، اعتدال اور توسع کے ساتھ پیش کیا ہے کہ امت میں اتحاد اور بقائے باہم کی خوشبو بکھرتی ہے۔انہوں نے کسی ایک فقہ کے وکیل صفائی بننے کے بجائے قرآن،سنت، حدیث اور اکابر ملت اسلامیہ کے متفق علیہ فیصلوں اور افکار کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

لیکن فی ظلال القرآن میں فقہی اختلافات،کلامی بحثوں اور لغت و بلاغت کی نکتہ آفرینیوں سے عموماً پرہیز کیا گیا ہے، کیوں کہ سید قطب کے خیال میں اس سے

قرآن کا حسن و جمال متأثر ہوتا ہے اور قاری اُن پر پیچ بحثوں میں الجھ کر قرآن کے مقصد نزول سے غافل رہتا ہے۔انہوں نے اپنی تفسیر میں دعوتی اور تربیتی پہلوؤں پر خاصا زور دیا ہے۔ وہ ہر مناسب موقع پر ایک دعوتی تقریر کر دیتے ہیں اور تزکیہ و تربیت کے تمام پہلوؤں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا مقصدِ تصنیف ہی اسلامی معاشرہ کی تاب ناک حکایتوں کو پیش کرنا ہے اور رسول اکرم ﷺ اور صحابہؓ کرام کے مثالی واقعات سے آج کی زندگی کو منوّر کرنا ہے، اسی لیے وہ سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ سے بھرپور استشہاد کرتے ہیں اور اسلامی اخلاق کے تمام گوشوں: تعلق باللہ ،توکل،صبر و استقامت، انابت و خشیت ،خدا ترسی اور فکر آخرت جیسے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔

اسرائیلیات سے اجتناب

دونوں تفاسیر میں اسرئیلیات سے مکمل اجتناب برتا گیا ہے۔ تفہیم القرآن میں ان پر بہت زوردار انداز میں تنقید کی گئی ہے، جب کہ فی ظلال القرآن میں ان پر وقت ضائع کرنا پسند نہیں کیا گیا ہے، اسرائیلی روایات کا سرچشمہ تورات اور اس کی شروح تلمود اور اس کے حواشی و تعلیقات ہیں۔ اسرائیلی روایات کی تین قسمیں ہیں۔ان کی نوعیت کے اعتبار سے ہم تصدیق ،تکذیب اور توقف اختیار کر سکتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے بائبل کے ان حصوں کا حوالہ دیا ہے جن سے قرآنی حوالوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہماری بعض کتب میں اسرائیلی روایات درآئی ہیں،جس کی وجہ سے خطرناک حد تک الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔مولانا مودودیؒ نے ایسے تمام مقامات پر اسرائیلی روایات پر عقلاً و نقلاً مؤثر اور دل نشیں پیرائے میں تنقید کرکے متعلقہ آیات کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے اسرائیلی روایات کو علماء قدیم کی تفسیروں سے نقل کرنے میں بہت ہی محققانہ اور عقلی اسلوب اختیار کیا ہے، جیسا کہ ان کی تفسیر میں عام طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر 'ید بیضاء' سے برص کا مرض ہونے کی تردید کے سلسلے میں مولانا مودودیؒ نے وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ (الاعراف:۱۰۸) کی تفسیر کے ضمن میں لکھا ہے:

''بعض مفسرین نے ید بیضاء کی تفسیر یہودی روایات سے متأثر ہوکر کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اپنی بغل میں ہاتھ ڈال کر نکالتے تو برص کے مرض کی طرح سفید ہو جاتا۔ مزید وہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ فرعون کو کیوں کہ برص کا مرض تھا، اسے یہ بتانا مقصود تھا کہ دیکھو، اس طرح مرض آتا بھی ہے اور آناً فاناً غائب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ابن جریرؒ، ابن کثیرؒ، زمخشریؒ، رازیؒ، ابوالسعو دعمادیؒ، آلوسیؒ، اور دوسرے بڑے بڑے مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہاں بیضاء بمعنی روشن اور چمک دار ہے، جونہی کہ حضرت موسیٰؑ نے بغل سے ہاتھ نکالا یکا یک سارا ماحول جگمگا اٹھا اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے سورج نکل آیا ہے۔ چوں کہ اول ذوق سلیم اس سے ابا کرتا ہے کہ کسی نبی کو برص کا معجزہ دے کر ایک بادشاہ کے دربار میں بھیجا جائے۔ دوسرے اگر فرعون کو مخفی طور پر برص کی بیماری تھی تو ید بیضاء صرف اس کی ذات کے لیے معجزہ ہوسکتا تھا، اس کے درباریوں پر اس معجزہ کا کیا رعب طاری ہوتا۔ لہٰذا صحیح بات وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ اس سے ہاتھ میں سورج کی سی چمک پیدا ہوجاتی تھی، جسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ قدیم مفسرین میں سے بہتوں نے اس کے یہی معنی لیے ہیں۔''[۲]

تفہیم القرآن میں قرآن کے مجملات کی تفصیل کے لیے، بالخصوص قصص الانبیاء کے بیان میں اسرائیلیات سے مدد لی گئی ہے۔ جو روایات قرآن اور احادیث سے متصادم نہیں تھیں ان کو مولاناؒ نے قرآن کی تشریحات و توضیحات میں استعمال کیا ہے، لیکن جو روایات قرآن و حدیث اور عقل وسلیم سے ثابت نہیں تھیں ان کے سلسلے میں سخت گیر موقف اختیار کر کے ان کی تردید بھی کی ہے، بلکہ جن مفسرین نے اس قسم کی روایات کو

نقل کرکے اس کی تاویلات کی ہیں ان کو شدید تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ اس سلسلے میں یوسف و زلیخا کی بھاگ دوڑ میں شیر خوار بچے کی شہادت، ان کے نکاح کے افسانے، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور دیگر انبیاء کے متعلق الزامات اور کردارکشی اور حضرت موسیٰؑ پر زیور ہتھیا لینے کے الزام کی تردید کی ہے۔ مثال کے طور پر آیت قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَاراً مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا (طٰہٰ: ۸۷) کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"یہ ان لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم نے زیورات پھینک دیے تھے۔ نہ ہماری کوئی نیت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے؟ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔ "لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے" اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصر کی رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہوگئے تھے۔ اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادیں پھریں۔ (بائبل میں ہے کہ مصر سے قبلِ ہجرت حضرت موسیٰؑ کو خدا نے کہا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں سے کہنا کہ وہ اپنی پڑوسی مصری عورتوں سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لینا۔ اس طرح ان کو لوٹ لینا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے بائبل کی کتاب خروج، باب ۳، آیت ۴ تا ۲۲، باب ۱۱، آیت ۲:۳، باب ۱۲، آیت ۳۵، ۲۶)

افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے اور ان کی غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ اسی لوٹ کا بوجھ تھا۔" [۳۱]

قدیم واقعات کے ضمن میں جو لایعنی اور غیر ضروری تفصیلات ہوتی تھیں ان کو

تفہیم القرآن میں نقل ہی نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ واقعہ کے ضروری اور مقصدی پہلوؤں ہی پر روشنی ڈالی جائے، من گھڑت داستانوں کو درج نہ کیا جائے۔ علامہ ابن کثیرؒ کے نزدیک اسرائیلیات کی روایات کا بیان کر دینا مباح ہے، جب کہ علامہ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا کہنا ہے کہ ان کے پیچھے پڑنا عبث ہے اور ان کا بیان کرنا نا مناسب ہے۔ مولانا مودودیؒ مؤخر الذکر اکابر کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں آسمان، زمین، نباتات اور حیوانات وغیرہ کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ قرآن کا مقصد ان اشیاء کے خواص کا بیان نہیں ہے، بلکہ ان کا ذکر توحید و آخرت کے اثبات کے لیے دلائلِ آفاق کے طور پر کیا گیا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ایسے تمام مقامات پر اسرائیلیات کے ذریعے قرآنی استدلال کو واضح کر کے ان کی غیر ضروری باتوں پر تنقید کی ہے۔

اس کے برعکس فی ظلال القرآن میں اسرائیلیات سے مکمل اجتناب برتا گیا ہے۔ سید قطب نے ان موضوع اور بے بنیاد روایات کو اپنی تفسیر میں نہیں نقل کیا ہے، جن سے رسول اللہؐ اور اسلام کی تعلیمات پر حرف آتا ہو۔ مثال کے طور پر وَوَضَعۡنَا عَنكَ وِزۡرَكَ (الانشراح:۲) کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ نبوت سے پہلے ایامِ جاہلیت میں نبیؐ سے کچھ قصور ایسے ہو گئے تھے، جن کی فکر آپ کو سخت گراں گزر رہی تھی۔ یہ آیت نازل کر کے اللہ نے آپ کو مطمئن کر دیا کہ آپ کے وہ قصور ہم نے معاف کر دیے ہیں۔ یہ تفسیر بالکل غلط اور قرآن کے تصور عصمت انبیاء کے خلاف ہے۔ حضورؐ کی جاہلیت کی زندگی بھی اس قدر پاکیزہ اور صاف و شفاف تھی کہ قرآن میں مخالفین کے سامنے اس کو ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ نبیؐ سے کفار کو مخاطب کر کے کہلوایا گیا تھا: فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيكُمۡ عُمُرٗا مِّن قَبۡلِهِ (یونس: آیت ۱۶) ''میں اس قرآن کو پیش کرنے سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں۔'' چنانچہ سید قطبؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''یہاں قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے تمہارے بوجھ کو، جو تمہاری پیٹھ

کے لیے بارگراں بنا ہوا تھا، یہاں تک کہ وہ ٹوٹی جا رہی تھی، تمہارے اوپر سے اتار دیا، تمہارا سینہ کھول دیا، تمہیں اس دعوت کی توفیق دی، تمہارے لیے دعوت حق کو آسان بنایا، نیز وحی نازل کی جو حقیقت کو واضح کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ دعوت دین کو کس طرح دلوں میں نرمی کے ساتھ اتارا جائے۔ اس طرح ہم نے تمہارے بوجھ کو ہلکا کردیا، بلکہ اسے اتار دیا، کیا تم اس بارگراں کے سلسلے میں، جو تمہاری کمر توڑے دے رہا تھا، اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے؟ کیا تم شرح صدر کے بعد اپنے بوجھ کو ہلکا محسوس نہیں کرتے؟''[۴۴]

اس تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہاں مصنف نے 'وزر' کے معنی 'گناہ کے نہیں، بلکہ بھاری بوجھ کے لیے ہیں اور اس سے مراد رسول اکرمؐ کی وہ تڑپ اور کسک ہے جو دور جاہلیت میں انسانیت کی حالت دیکھ کر آپؐ محسوس کرتے تھے۔

سائنسی جدّت طرازیوں کے سلسلے میں موقف

قرآن اصلاً کتابِ ہدایت اور کتابِ انقلاب ہے۔ کفر وشرک اور الحاد واباحیت کی تاریکیوں میں یہ مشعل صراط مستقیم کی روشنی دکھاتی اور انسانی ذہن وعمل کو تبدیل کرتی ہے۔ اللہ کی عظمت اور اس کی قدرت وعلم کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرانے کے لیے کائناتی معجزوں کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں۔ اس طرح کائناتی علوم بھی جا بجا قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں۔ قرآن چوں کہ اللہ کا کلام ہے اور یہ حسین وجمیل کائنات اس کی مخلوق ہے، اس لیے دونوں میں تضاد ناممکن ہے۔ اس حیثیت سے علوم کی ترقی اور سائنسی نظریات کا ارتقا قرآنی آیات کے خلاف نہیں ہوسکتا، لیکن سائنس کے تغیر پذیر نظریات اور ہمہ وقت تبدیلی کے لیے آمادہ تجربات واکتشافات کا فکری ماحول ایسا نہیں ہے کہ ان پر قرآنی آیات کی صداقت کو پرکھا جائے یا ان پر قرآن کا اس درجہ انطباق کیا جائے کہ یہ کتاب الٰہی علوم وفنون کی دائرۃ المعارف سمجھی جانے لگے اور ان ہمہ وقت متبدل افکار کی زد میں نعوذ باللہ قرآنی صداقت بھی آجائے۔

علوم وفنون کے سلسلے میں قرآنی موقف کے بارے میں علماء ومفسرین افراط و تفریط کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف مفسرین کا وہ طبقہ ہے جو جدید ماحول کے تقاضوں سے بے نیاز ہوکر محض تفسیر وتشریح میں لگا ہوا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے ہر نئے نظریہ کی تائید قرآن سے فراہم کی۔ مارکس کے معاشی فلسفوں کی حمایت میں اس نے اسلامی سوشلزم کا نظریہ پیش کیا، ہٹلر اور مسولینی کی حاکمیت واقتدار کو دیکھ کر انہیں قرآن کا اصل مخاطب گردان لیا، گاندھی کے عدم وتشدد کے غیر اسلامی نظریہ کی تائید میں انہوں نے جہاد اسلامی کا چہرہ مسخ کردیا اور اب سائنس کی ترقیوں سے مسحور ہوکر انہیں قرآن کی آیات سے صحیح و درست ثابت کرنے لگا۔ افراط وتفریط کا یہ کھیل عالم اسلام میں جاری ہے، لیکن مولانا مودودیؒ اور سید قطب شہیدؒ اس نقص سے بالکل پاک ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ آج تک جو چیزیں انسانی مشاہدے سے سامنے آئی ہیں وہ قرآنی حقائق کے قطعی ہونے کا ثبوت پیش کررہی ہیں اور کوئی ایسا مشاہدہ اور تحقیقات سامنے نہیں آئی ہیں جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کو غلط ثابت کرسکے۔ اس سلسلے میں دونوں تفاسیر کا اندازہ ان کی مثالوں کے ذریعے لگایا جاسکتا ہے۔

آیت يَسْأَلُونَكَ عَنِ الأهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (البقرۃ:۱۸۹) کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام و تخیلات اور رسوم دنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہل عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے، چاند سے اچھے یا برے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع وغروب اور اس کی کمی وبیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں

پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہل عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں ان میں رائج تھیں۔ انہی چیزوں کی حقیقت نبیؐ سے دریافت کی گئی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے۔ جو آسمان پر نمودار ہو کر دنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی، تمدنی، اور معاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے چار مہینے حج اور عمرے سے وابستہ تھے۔ ان مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔''۵؎

آیت أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَهُمَا (الانبیاء:۳۰) ''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔'' کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کہتے ہیں:

''اصل میں رتق اور فتق کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رتق کے معنیٰ ہیں یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا اور فتق کے معنیٰ پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (Mass) کی سی تھی، بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔

آیت وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (یٰسین:۴۰) ''چاند سورج [یعنی تمام اجرام فلکی] سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں'' کی تشریح کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

'' فلک کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (Orbit) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم سماء (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے۔

یہ ارشاد ہے کہ ’’سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں‘‘ چار حقیقتوں کی نشان دہی کرتا ہے: ایک یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام سیارے اور اجرام فلکی متحرک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فلک یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے۔ تیسرے یہ کہ افلاک تاروں کو لیے ہوئے گردش نہیں کررہے ہیں، بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں۔ چوتھے یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔‘‘

ان آیات کا اصل مقصد علم ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لے کر آسمان تک جدھر بھی وہ نظر ڈالے گا اس کے سامنے اللہ کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حدو حساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دہریت اور شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس نظام شمسی میں شامل ہے، اس کی عظمت کا حال یہ ہے کہ اس کا مرکز سورج زمین سے ۳/لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کے بعید ترین سیارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲/ارب ۷۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے، بلکہ اگر پلوٹو کو بعید ترین سیارہ مانا جائے تو وہ سورج سے ۴/ارب ۶۰ کروڑ میل تک دور پہنچ جاتا ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظام شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس کہکشاں (Galaxy) میں ہمارا یہ نظام شمسی شامل ہے اس میں تقریباً ۳ ہزار ملین (۳/ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴/سال صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً ۲۰/لاکھ لولبی سحابیوں (Spirar nebujae) میں سے ایک ہے اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر

زیادہ ہے کہ اس کی روشنی ۱۰/لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرام فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں ۱۰/کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدہ میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائع مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔'' ے

سید قطب شہیدؒ قرآنی آیات اور ان کے مطالب کو ماضی وحال کے انسانی سماجوں اور ان کے حالات پر بہت عمدگی اور کامیابی سے منطبق کرتے ہیں اور موجودہ دور کی انسانیت کے دکھوں کا علاج اور ان کے لاینحل مسائل کا حل ان کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ مولانا مودودیؒ کے مماثل نظر آتے ہیں۔ وہ دورِ حاضر کی علمی وسائنسی معلومات سے پوری طرح استفادہ کرتے ہیں، لیکن قرآن کو علم وسائنس کا تابع بنانے کے بجائے سائنس کو قرآن کا تابع بناتے ہیں۔ قرآن اور سائنس کے باہمی ربط پر ان کے مباحث بہت قیمتی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۸۹ یہ ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَج [البقرۃ: ۱۸۹] (اے نبیؐ لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہو یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے سید قطبؒ لکھتے ہیں:

''سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے کی مختلف صورتوں کے متعلق کیا گیا تھا، لیکن جواب یہ دیا گیا کہ یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں۔ لوگوں کے روزہ وافطار، نکاح وطلاق وعدّت، معاملات، تجارت اور حسابات، سب انہی تاریخوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں اور پھر حج بھی اسی سے انجام پاتا ہے۔ یعنی دین و دنیا کے سارے معاملات انہی تاریخوں کے ذریعہ انجام پذیر ہوتے ہیں۔ یہاں جواب میں چاند کی

تخلیق، نظام شمسی میں اس کا وظیفہ، اجرام سماوی کی حرکت کو متوازن رکھنے میں اس کا کردار وغیرہ فلکیاتی و سائنسی بحثیں نہیں چھیڑی گئیں، کیوں کہ یہ قرآن کے مخصوص مزاج، مخصوص نصب العین، مخصوص نظام اور مخصوص معاشرہ کی تشکیلی جدوجہد کے خلاف تھیں۔ قرآن کا مقصد تو اس سرزمین میں ایک نئی امت برپا کرنا ہے، جو انسانیت کی قیادت میں مؤثر کردار ادا کرے۔ ایک مخصوص طرز زندگی اور مخصوص قسم کی معاشرت کا قیام اس کا مقصود ہو، تاکہ اس نظام کے اصول و مبادی اس سرزمین پر جاری ہوسکیں اور انسانوں کی ان کی طرف رہ نمائی کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں اس قسم کا نا معقول جواب کیسے دیا جاسکتا ہے۔[۸]

پھر سید قطبؒ ان مفسرین پر تبصرہ کرتے ہیں جو افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے ان سادہ لوح لوگوں پر حیرت اور تعجب ہوتا ہے جو قرآن پر وہ چیزیں تھوپنے کی جسارت کرتے ہیں جن کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور وہ معانی و مفاہیم تراشتے ہیں جو اس کا مقصود نہیں ہوتے اور طب، کیمیا اور فلکیات وغیرہ علوم کی جزئیات و تفصیلات کا اس سے استخراج کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں اور قرآن کا مقام بلند کر رہے ہیں! قرآن اپنے موضوع پر مکمل کتاب ہے اور اس کا موضوع ان علوم سے بہت بلند اور اعلیٰ ہے، کیوں کہ وہ انسان ہی ہے جو ان تمام علوم کا اختراع کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور تجربہ، بحث و تحقیق اور تنفیذ عقل انسانی کی خصوصیات ہیں اور قرآن اسی انسان کی شخصیت اس کے ضمیر، اس کی عقل اور اس کی فکر کی تشکیل کرتا ہے۔''[۹]

قرآنی حقائق قطعی، مطلق اور آخری ہیں، لیکن انسانی تخلیق کے نتائج قطعی ہیں نہ حتمی۔ یہ تو تجربات اور ان کے حالات و وسائل کی محدودیتوں کا شکار ہیں، اس لیے یہ

طریق فکر اور طریقِ عمل کی غلطی ہوگی کہ قرآن کے حتمی قطعی اور غیر فانی حقائق کا غیر حتمی حقائق سے تقابل کیا جائے۔ سید قطب نے اس جدید نقطۂ نظر کے تین بڑے اسباب بیان کیے ہیں:

۱۔ اس غلط زاویہ کی پہلی وجہ وہ داخلی انتشار اور اندرونی شکست ہے جو ہمارے علماء پر طاری ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سائنس ہی محافظ ہے اور قرآن اس کا تابع ہے۔ چنانچہ وہ قرآن کو سائنس کے ذریعہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، جب کہ قرآن ہر حیثیت سے مکمل ہے۔

۲۔ خود قرآن کے مزاج اور اس کے وظیفۂ عمل کے متعلق غلط فہمی عام ہے۔ قرآن حقیقی، حتمی اور آخری حقیقت ہے، جو انسان کی تعمیر اس طرح کرتا ہے کہ اس عالم موجودات اور خدائی قوانین میں وہ کوئی تصادم محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس تصور قرآنی کے ذریعہ وہ کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوتا ہے اور تجربہ و تحقیق سے اپنی خلافت میں رازہائے دروں سے نقاب اٹھاتا اور ان سے کام لیتا ہے، لیکن قرآن کا یہ وظیفۂ حیات عام مسلمانوں سے مخفی ہے۔

۳۔ تیسری وجہ قرآن کی مصنوعی اور تکلّفانہ تفسیر ہے، تاکہ نصوص قرآن کو سائنس کی ترقیوں سے ہم آہنگ بنایا جا سکے۔ ۱۰

سید قطبؒ اس امر کی تردید کرتے ہیں کہ سائنسی ترقیات سے چشم پوشی کر لی جائے اور فہم قرآن میں جدید نظریات و اکتشافات سے فیض نہ اٹھایا جائے، جب کہ قرآن کا اعلان ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقّ (حٰم السجدہ: ۵۳) لیکن سوال یہ ہے کہ ان ترقیات سے استفادہ کس طرح کیا جائے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ قرآن کریم کی آیت وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان: ۲) سے بحث کرتے ہیں کہ آج سائنسی ترقیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کائنات میں بڑی مہارت کے ساتھ نظم و نسق اور توافق پایا جاتا ہے۔ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور سورج متعین فاصلہ پر موجود ہے۔ چاند کا دائرہ عمل متعین ہے اور سورج اور چاند کا حجم زمین کے حجم کے مقابلہ میں متعین ہے اور ان سب

میں ایک زبردست نظم و ضبط کارفرما ہے، جو کسی حادثاتی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ترقیاں اور مشاہدے بتاتے ہیں کہ اللہ نے ہر چیز کی تخلیق متعین کی اور ہر ایک کا ایک اندازۂ خاص رکھا۔اس طرح کے مشاہدات اخذ کرنے اور ان سے استدلال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۱۱]

جدید علوم سے استفادہ

جدید علوم سے استفادہ تفہیم القرآن اور فی ظلال القرآن دونوں تفسیروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔مولانا مودودیؒ قرآنی واقعات کی تاریخ، مقامات اور اقوام کونقشوں اور مستند تاریخ کے ذریعے نمایاں کرنے کے لیے آثار قدیمہ کی قدیم و جدید معلومات سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔اس سلسلے میں انہیں جو چیز قرآن سے ہم آہنگ نظر آئی اس کو پیش کیا ہے اور جو چیز اس سے مغایر نظر آئی اس پر تنقید کی ہے۔سرسید احمد خاں کی تفسیر میں جو مغربی مرعوبیت جھلکتی ہے، مولانا مودودیؒ نے اس پر بھی تنقید کی ہے۔سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کوئی چیز عقل اور قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہوسکتی۔مولانا مودودیؒ نے بڑے معقول اور مدلل طریقہ سے اس کا رد کیا ہے اور کئی جگہ اس اساس پر کی گئی تحریفات کو باطل قرار دیا ہے۔مولانا مودودیؒ اسلام کی صداقت پر کامل یقین رکھتے تھے۔وہ قدیم و جدید معلومات کو فراہم کرنے کے لیے مغربی مفکرین وغیرہ کے حوالے اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ قرآن کے سلسلے میں مزید نئی معلومات حاصل ہوسکیں۔مثال کے طور پر سورہ انعام کی آیت وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوْقِنِيْن کی تشریح کے دوران لکھتے ہیں:

> ’’اس مقام کو اور قرآن کے ان دوسرے مقامات کو جہاں حضرت ابراہیمؑ سے ان کی قوم کی نزاع کا ذکر آیا ہے، اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے مذہبی وتمدنی حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔جدید اثری تحقیقات کے سلسلہ میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہوگیا ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے، بلکہ دورِ ابراہیمی

میں اس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔" سر لیو نارڈ وولی (Sir Leonard Woolley) نے اپنی کتاب ("Abraham"London,1935) میں اس تحقیقات کے نتائج شائع کیے ہیں۔"[۱۲]

آگے انہوں نے اس کتاب کے حوالہ سے حضرت ابراہیمؑ کے وطن کے جغرافیائی، تمدنی اور سماجی احوال بیان کیے ہیں۔

اصحابِ کہف کے واقعہ کے ضمن میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"شہر افسوس (Ephcsus)، جس میں اصحابِ کہف کا واقعہ پیش آیا، تقریباً گیارہویں صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا اور بعد میں یہ بت پرستی کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں چاند دیوی کی پوجا ہوتی تھی، جسے ڈائنا (diana) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی کا عظیم الشان مندر عہد قدیم کے عجائباتِ عالم میں شمار کیا جاتا ہے، ایشیائے کوچک کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے اور رومی سلطنت نے بھی اس کو اپنے معبودوں میں شامل کرلیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں پہنچنی شروع ہوئی تو اس شہر کے چند نوجوان بھی شرک سے تائب ہوکر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔"

پھر مغربی مصنف Gregory Of Tours کی کتاب Meraculorum Liber سے اقتباسات پیش کرکے قرآن کی تائید میں مزید جدید معلومات فراہم کرتے ہیں اور آخر میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "غار والوں کی یہ داستان جو مسیحی روایات میں بیان ہوئی ہے، قرآن کے بیان کردہ قصّے سے اتنی مطابقت رکھتی ہے کہ انہی کو اصحابِ کہف قرار دینا بہت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔"

یہی یکسانیت تفسیر فی ظلال القرآن میں بھی پائی جاتی ہے۔ سید قطب شہیدؒ نے اپنی تفسیر میں بہت احتیاط اور اعتدال کے ساتھ مغربی علوم اور ان کے بے ضرر ارتقائی مراحل کو قرآنی آیات کی تفہیم و تفسیر میں استعمال کیا ہے۔

سر سید مرحومؒ کی تفسیر میں مغربی فکر سے مرعوبیت صاف جھلکتی ہے اور اسلامی احکام اور قرآنی تعلیمات پیش کرنے کا ان کا انداز اعتذاری ہے، جب کہ سید قطبؒ اسلام کی صداقت پر کامل یقین رکھتے، قرآنی متشابہات پر بعینہ ایمان لاتے اور ناقابل فہم مقامات پر توقف کرتے ہیں۔ وہ جدید علوم کے مراکز میں بیٹھ کر ان کا کھوکھلا پن اور انحطاط دیکھ چکے تھے اور وہاں سے مومن و مسلم بن کر واپس ہوئے تھے۔ اس لیے انھوں نے علوم کو قرآن کا مرکب بنا کر بڑے محکم یقین کے ساتھ اسلام کی حقانیت کو پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ اعلیٰ کی آیت: الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی. وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی کی تفسیر میں انھوں نے اپنے خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے:

"خدا نے جس چیز کو بھی پیدا کیا، اس کی ساخت اور تخلیق کی تکمیل کی اور اس کو درجۂ کمال تک پہنچایا، جو اس کے لیے مناسب و موزوں ہے۔ ....ایک مفرد ہونے کی حالت میں بھی اپنی برقیات، پروٹون اور الیکٹرون کے مابین کامل توازن رکھتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کا توازن جو کہ نظام شمسی میں سوستاروں اور ان کے توابع کے مابین ہے! ایٹم کو اپنی راہ معلوم ہے اور اسی کے مطابق وہ اپنے فرائض و اعمال انجام دیتا ہے۔ ایک واحد زندہ خلیہ اپنی تخلیق میں مکمل ہوتا ہے۔ وہ اپنے تمام مفوّضہ اعمال انجام دینے کی کامل صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا حال ان انتہائی ترقی یافتہ مخلوقات کا سا ہے جو مرکب ہیں اور جن کا ترکیبی نظام پیچیدہ ہے۔ ایک مفرد ایٹم اور نظام شمسی اور ایک واحد خلیہ اور کائنات کی انتہائی ترقی یافتہ زندہ مخلوقات کے مابین مختلف نظاموں اور ترکیبوں پر مشتمل بہت سی مخلوقات مختلف درجات کی ہیں۔ یہ مخلوقات ویسا ہی تخلیقی کمال اور ویسا ہی اجتماعی توازن رکھتی ہیں۔ ان میں بھی نظم و تدبیر امر اور منصوبہ بندی ہے۔ پوری کائنات اس عظیم و عمیق حقیقت پر شاہدِ عادل ہے۔"[۱۴]

پھر سید قطب امریکی سائنس داں (A .Cressy Morisson) کی کتاب

Man Does Not Stand Alone سے اقتباسات پیش کر کے قرآن کی تائید میں مزید جدید معلومات فراہم کرتے ہیں اور آخر میں ایک مومنانہ تبصرہ بھی کرتے ہیں کہ یہ ساری معلومات چند اشارے ہیں، جو اللہ نے ہماری کم زور بشری تخلیق کی طاقت کے بقدر کیے ہیں۔

مغربی افکار اور جدید نظریات پر تنقید

عہد جدید کے افکار و نظریات اور نظامِ تمدن و اجتماع کی کوکھ سے فکر و عمل کی جن بڑی بڑی گم راہیوں اور فتنوں نے جنم لیا ہے وہ سب اسلامی نظریۂ زندگی اور نظام حیات کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں اور عملاً انہوں نے امت مسلمہ کو تشکیک، بے یقینی، بدعملی اور بے راہ روی کی تاریکیوں کی طرف دھکیلا ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو یہ حقیقت یک گونہ اطمینان وسکون فراہم کرتی ہے کہ تفہیم القرآن اور فی ظلال القرآن جیسی تفسیروں نے ہر فتنے اور ہر گم راہی کا پوری استدلالی قوت کے ساتھ توڑ کیا ہے اور بے مثال ناقدانہ تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ سے اس کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔ دونوں تفاسیر میں مغربی افکار اور جدید نظریات پر بھرپور تنقید ملتی ہے اور دونوں نے مغربی تہذیب کے طلسم کو چاک کرنے کی کام یاب کوشش کی ہے۔

صاحب تفہیم القرآن نے اپنی تفسیر میں قرآن کے مطالب کی وضاحت کرتے ہوئے دورِ حاضر کے ملحدانہ فلسفۂ زندگی اور باغیٔ خدا نظامِ تمدن و معاشرت پر کڑی تنقید کی ہے۔ انہوں نے دوسرے فتنوں (مرعوبیت، انکارِ حدیث، انکارِ ختم نبوت، وغیرہ) کی حقیقت سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے ساتھ مادہ پرستی (Materialism) اور افکار مغرب کی بنیادی کج روی کو خوب واضح کیا ہے۔ ڈارون سے لے کر فرائڈ تک اور ہیگل سے لے کر مارکس تک دنیائے مغرب کا کوئی فلسفی، دانش ور اور نظریہ ساز ایسا نہیں ہے جس کی فکری کجی اور نظری انحراف کا تفہیم القرآن میں احاطہ نہ کیا گیا ہو۔ مولانا مودودیؒ بحث کے دوران برائی کی اصل جڑ کی نشان دہی بھی کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''دنیا میں خدا کے بندوں کو گم راہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے اور راہِ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے، اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں۔ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہ نمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ان نام نہاد اہلِ کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھلّم کھلاّ دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹادینے کے علی الاعلان عزم وارادہ پر تعمیر کیا گیا اس کے موجد ومخترع اور بانی وسربراہ کار موسیٰؑ کے نام لیوا ہوں۔ اشتراکیت کے بعد زمانۂ جدید میں گم راہی کا دوسرا بڑا ستون فرائڈ کا فلسفہ ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔''[۱۵]

تفہیم القرآن میں دور جدید میں سرمایہ داری کے بگاڑ کا تجزیہ کرتے ہوئے منکرین حدیث، منکرین ختم نبوت اور معتقدین مارکس کے بعد جس گروہ کو سب سے زیادہ مولانا مودودیؒ نے نشانہ بنایا ہے، وہ یہی سرمایہ پرست ہیں۔ایک ایسے دور میں جب کہ سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے خلاف محض نعرے بلند کرنے کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا، مولانا مودودیؒ نے اس نظام کی شہ رگ پر حملہ کیا اور بتایا کہ جو بنیاد موجودہ سرمایہ دارانہ معاشروں کا نچوڑ رہی ہے وہ سود ہے۔سود، جسے اسلام حرام قرار دیتا ہے، وہی اس دور کے سرمایہ دارانہ نظام کی زندگی ہے۔اگر سرمایہ داری نظام سے سود کو نکال دیا جائے تو اس کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے گر جائے گی۔[۱۶]

کیپٹیل ازم اور مارکسزم کے ساتھ مولانا مودودیؒ نے عصرِ حاضر کے جن دوسرے تباہ کن فتنوں کی طرف توجہ دی ہے، وہ امپریلزم اور نیشنل ازم یعنی سامراجیت اور لادین قومیت کے فتنے ہیں۔سید مودودیؒ امپریلزم کی اساس اور اس کے ثمرات و نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''فاتح قوموں کی دوسری قوموں پر دست درازی کبھی اصلاح اور خیر خواہی کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسری قوم کو خدا نے جو رزق دیا ہے اور جو وسائل و ذرائع عطا کیے ہیں ان سے وہ خود متمتع ہوں اور اس قوم کو اتنا بے بس کر دیں کہ وہ کبھی ان کے مقابلے میں سر اٹھا کر اپنا حصہ نہ مانگ سکے۔ اس غرض کے لیے وہ اس کی خوش حالی اور طاقت اور عزت کے تمام ذرائع ختم کر دیتے ہیں، اس کے جن لوگوں میں بھی اپنی خودی کا دم داعیہ ہوتا ہے انہیں کچل کر رکھ دیتے ہیں، اس کے افراد میں غلامی، خوشامد، ایک دوسرے کی کاٹ، ایک دوسرے کی جاسوسی، فاتح کی نقالی، اپنی تہذیب کی تحقیر، فاتح تہذیب کی تعظیم اور ایسے ہی دوسرے کمینہ اوصاف پیدا کر دیتے ہیں اور انہیں بتدریج اس بات کا خوگر بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی کسی مقدس سے مقدس چیز کو بھی نہ بیچ دینے میں تامل نہ کریں اور اجرت پر ہر ذلیل خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔'' [۱۷]

تفہیم القرآن میں تہذیبِ مغرب اور مادہ پرست افکار کا کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جس کی حقیقت نہ کھولی گئی ہو، مرعوبیت اور دین کے معاملہ میں احساس کم تری و کہتری کی کوئی بنیاد ایسی نہیں ہے جسے اکھاڑ نہ پھینکا گیا ہو۔ اشتراکیت اور مارکسزم کے پرستاروں کا کوئی حربہ ایسا نہیں ہے جس پر گرفت نہ کی گئی ہو۔

یہی طرز سید قطب شہیدؒ کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کی تفسیر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم مذاہب پر صاحب تفسیر کی گہری نظر ہے۔ اس کے ساتھ جدید نظریات کی خامیوں سے بھی انہیں بھرپور واقفیت ہے۔ قرآنی آیات کی تفسیر کرتے وقت وہ قدیم و جدید مذاہب و نظریات پر تنقید بھی کرتے جاتے ہیں اور ان کی بے بسی سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں، تاکہ مسلم نوجوان اسلام کی قدر و قیمت کو پہچان سکیں، ہر چمکتی چیز کو سونا نہ سمجھ بیٹھیں اور ہر نئی فکر پر نقدِ دل نہ ہار بیٹھیں۔ مثلاً سورۃ العصر کی تفسیر میں وہ اسی پر گفتگو کرتے ہیں کہ اللہ کی نظر میں انسان معزز و محترم ہے اور اس نظریہ پر ایمان رکھنے سے

انسان کی ذات خود اس کی نگاہ میں بلند اور معزز ہوتی ہے۔اس بات کی وضاحت کے بعد وہ کہتے ہیں:

''اسی واسطے ڈارؤنیت ،فرائڈیت اور مارکسیت کی تعلیمات وہ بدترین اور خبیث ترین چیزیں ہیں جن سے انسانی فطرت اور انسانی شعور کو سابقہ پیش آیا ہے۔یہ تعلیمات انسان کو اس گم راہی اور کج فکری میں مبتلا کرتی ہیں کہ ہر پستی، ہر گندگی اور ہر رذالت فطری اور طبعی ہے۔ یہ نہ کوئی انوکھی اور حیرت ناک بات ہے اور نہ اس میں شرمانے کی کوئی ضرورت۔حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلیمات نوع انسانی کے سلسلے میں عظیم جرم کی حیثیت رکھتی ہیں اور شدید نفرت وتحقیر کی مستحق۔''[۱۸]

سورۂ عبس کی تفسیر میں سید قطبؒ اس اصول پر گفتگو کرتے ہیں کہ عوام کو قدریں اور پیمانے زمین سے نہیں، آسمان سے حاصل کرنا چاہیے، آسمانی وخدائی تعلیمات سے اخذ کیا جانا چاہیے نہ کہ زمینی طریقوں اور رجحانات سے پھر وہ اسلام کے نظام عدل کا مثالی دور اور اس کی نمایاں خصوصیات بیان کرتے ہیں اور اسلامی معاشرے کی خود کفایتی اور باہم تکافل وتعاون پر استوار معاشی و سیاسی زندگی کی جھلکیاں دکھانے کے بعد آخر میں کہتے ہیں:

''یہ آسمانی میزان طویل عرصے تک زمین میں قائم رہی۔اس کے نتیجے میں اہلِ تقویٰ کو سماج میں بلند و برتر مقام حاصل رہا۔خواہ برتری کے زمینی معیارات کے لحاظ سے وہ کتنے ہی تہی دست اور پست رہے ہوں، لوگوں کے اپنے اور دوسروں کے جانچنے کے لیے یہی میزان فیصلہ کن رہی۔ یہ بالکل حال کی بات ہے کہ اس میزان کا چلن زمین پر سے اٹھ گیا، 'جاہلیت' کے طغیان نے زمین کے گوشے گوشے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔آج امریکہ میں، جو مغرب کا امام ہے،انسان کی قدرو قیمت اور اس کے مقام کو اس کے سرمایے کی بنیاد پر متعین کیا جاتا ہے اور روس میں، جو مشرق کا امام ہے اور جہاں مادہ پرستانہ نظام 'کمیونزم' مسلط ہے۔انسان کی قیمت آلات سے بھی کم ہوگئی ہے۔رہے دیگر

ممالک تو ان کا حال بھی ابتر ہے۔ 'جاہلیت اولیٰ' جس کے استیصال کے لیے اسلام آیا تھا، ان ممالک پر پھر سے مسلّط ہوگئی ہے۔ وہ نظریات اور نعرے جنہیں اسلام نے کالعدم کر دیا تھا ان میں پھر سے ان کا چلن عام ہوگیا ہے۔ خدا کی میزان چکنا چور کردی گئی ہے اور لوگ ان حقیر اور پست جاہلی اقدار کی طرف پلٹ رہے ہیں جن کی کوئی نسبت ایمان و تقویٰ سے نہیں ہے۔ امید کی اب صرف ایک ہی کرن ہے اور وہ یہ کہ موجودہ دور کی اسلامی دعوت پوری انسانیت کو پھر 'جاہلیت' کے شکنجے سے نجات دلائے اور اس کے ہاتھوں سے اسی طرح انسانیت کی نئی پیدائش ہو جس طرح دورِ اول میں ہوئی تھی۔''[۱۹]

کارل مارکس مذہب کو عوام کے لیے افیون قرار دیتا تھا اور کہتا تھا کہ مذہب ایک جال ہے، جسے معاشی استحصال کرنے والے طبقات نے غریب عوام اور مزدوروں کا استحصال کرنے اور انہیں زندگی بھر دھوکے میں رکھنے کے لیے تیار کیا ہے، تاکہ وہ ظلم و جبر کے خلاف مقابلہ کے لیے اٹھنے کے بجائے اسی نشہ میں بدمست رہیں اور جنت کے 'خیالی تصور' کو مقصود بنا کر اس دنیا میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے جدّ و جہد نہ کرسکیں۔ سید قطبؒ سورۂ مطفّفین کی تشریح میں اس باطل نظریہ کی تردید اور اسلام کے صحیح مؤقف کی ترجمانی یوں کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام انسان کی واقعاتی زندگی اور اس کے تمام عملی حالات پر حاوی ہے اور انسانی زندگی کو اقدار و اخلاق کی محکم اور عمیق بنیادوں پر قائم کرنا دین قیم کی عین فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کو ظلم اور معاملات میں اخلاق سے انحراف کی یہ روش گوارا نہ ہوسکی، حالاں کہ اجتماعی زندگی کی زمام ابھی اس کے ہاتھ میں نہ آئی تھی کہ وہ قانون کی قوت اور حکومت کی طاقت کے بل بوتے پر شریعتِ الٰہی کے مطابق اجتماعی زندگی کی تنظیم و تشکیل کرنے کی پوزیشن میں ہوتا۔ اس کے باوجود اسلام نے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے خلاف بہ بانگِ دہل اعلانِ جنگ کر دیا اور انہیں تباہی و بربادی کی دھمکی

دی، جب کہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے معمولی لوگ نہیں، مکہ کے سردار اور رسوخ و اقتدار کے مالک تھے۔وہ بت پرستی کے عقیدہ کے واسطے عوام کے ذہنوں اور روحوں پر اثر و اقتدار رکھتے تھے، ان کی اقتصادیات اور ان کی معاش کے مختلف پہلوؤں پر بھی ان کا تسلط تھا۔ اسلام نے عامۃ الناس کی اس معاشی لوٹ کھسوٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، جو اپنے بڑوں کے استحصال کے آگے مجبور تھے، جو ان کے سامان اور ان کے کھانے پینے کی چیزوں کی تجارت کرتے اور فریب دہی اور ذخیرہ اندوزی کے ناپاک طریقوں سے انہیں لوٹتے۔ یہ معاشی لٹیرے دینی اوہام کی بنیاد پر اس وقت کے عوام پر غلبہ و اقتدار بھی رکھتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی پروانہ کی اور اس صدائے احتجاج کے ذریعہ، جو اس کی ذات اور اس کے آسمانی طرز زندگی سے ابھر کر بلند ہوئی استحصال کے مارے فریب خوردہ عوام کو ہوشیار و بیدار کیا۔ اس نے عوام کو سلانے کا کام کبھی نہیں کیا، اس وقت بھی نہیں جب کہ وہ مکہ میں مجبور و محصور تھا اور مکہ کے ظالم و جابر سرداروں کی طاقت کا نشانہ بنا ہوا تھا، جو اپنی دولت، جاہ و مرتبہ اور دین کی بنیاد پر سماج میں اثر و اقتدار رکھتے تھے۔''[۲۰]

مآخذ کا تقابل

کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک مشکل کام ہے، لیکن جب معاملہ قرآن کریم جیسی الہامی کتاب اور الٰہی پیغام کا ہو تو اس ذمہ داری کی نزاکت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مولانا مودودیؒ سے قبل قرآن کریم کے اکثر اردو ترجمے لفظی سانچوں کے قریب رہ کر کیے گئے تھے، مگر ان میں یہ کمی تھی کہ اسے پڑھتے وقت قرآن کا مفہوم پڑھنے والے تک منتقل نہیں ہو پاتا تھا۔ اردو میں مولانا فتح محمد جالندھریؒ کا ترجمہ کئی حوالوں سے بہتر اور عام فہم تھا، لیکن اس کے لیے انھوں نے قوسین میں بہت سی اضافی عبارتوں کا سہارا لیا تھا۔ مولانا مودودیؒ نے ترجمۂ قرآن کے لیے قرآنی آیات کی

ترجمانی کا راستہ اختیار کیا اور کلام الٰہی کے حدود کا حد درجہ خیال رکھا کہ اسی دائرے میں رہتے ہوئے کلام پاک کو اردو خواں طبقے تک منتقل کریں۔ ماہرین لسانیات کے بقول مولانا مودودیؒ نے قرآن سمجھنے کے لیے اپنے قاری کی بے پناہ دست گیری کی ہے۔ انہوں نے ترجمے میں روانی اور ربط کا خیال رکھا ہے اور اسے عام فہم اور با محاورہ بنا کر پیش کرتے ہوئے دل کش انداز اختیار کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن لکھتے وقت کلاسیکی اسلوب سے ذرا ہٹ کر، لیکن تفسیری روایت اور قرآن وحدیث کے متن سے جڑ کر تفسیری خدمت انجام دی ہے، جس کی وجہ سے ان کی یہ تفسیر معلومات کا خزانہ معلوم ہوتی ہے۔ مولانا نے تفسیر لکھنے سے پہلے اعلیٰ پائے کے تفسیری ادب اور امہات تفاسیر کا مطالعہ کیا۔ احادیث نبوی کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ذخیرے کا مطالعہ کر کے موضوعات کا اشاریہ بنایا، مسلم تاریخ اور فقہی لٹریچر کی بنیادی کتب کے مباحث اور کلامی معرکوں کو ذہن نشین کیا۔ دوسری جانب اپنے آپ کو عصر حاضر سے جوڑتے ہوئے مغربی افکار ونظریات اور برسر پیکار عالمی و مقامی تحریکات، مثلاً نسل پرستی، سرمایہ داری، اشتراکیت، لادینیت، استعماریت اور نام نہاد آزاد خیالی کے نام پر پیدا کی گئی عریانی و فحاشی کے سرچشموں کو گہرائی میں جا کر پرکھا۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں میں نے ویدوں کے تراجم لفظ بلفظ پڑھے، بھگوت گیتا لفظ بلفظ پڑھی، ہندو شاستروں کو پڑھا۔ بدھ مذہب کی اصل کتابیں جو انگریزی میں ترجمہ ہوئی ہیں، ان کو پڑھا، بائبل پوری پڑھی اور پادری ڈوملیو کی تفسیر کی مدد سے پڑھا۔ یہودیوں کی اپنی کتابوں کو پڑھا، تلمود کے جتنے حصے مل سکے وہ سب پڑھے۔''[۲۱]

مولانا مودودیؒ کو اردو، عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی دست رس حاصل تھی۔ آپ کی تفسیر میں علمی وعقلی استدلال اور انقلابی پہلو غالب ہے۔ اس کی بہترین خاصیت یہ ہے کہ آپ حوالہ کے ذریعے اپنی بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی

وجہ سے اس میں مآخذ کا بھرپور حوالہ پایا جاتا ہے، جب کہ عام مفسرین کی تفسیریں اس سے خالی ہیں۔ یہ چیزیں اسے تمام تفاسیر کے درمیان ایک انفرادی مقام عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مولانا مودودیؒ جس کتاب سے اقتباسات نقل کرتے ہیں، چاہے وہ اسلامی کتب ہوں یا فقہی، تفسیر، سیرت و مغازی کی کتابیں ہوں یا کسی خاص موضوع سے متعلق، یا سائنس یا تاریخ کی کتابیں ہوں، سب کے حوالے نقل کرتے ہیں۔ کسی بھی حوالے کو غیر ضروری سمجھ کر نہیں چھوڑتے۔ آپ نے جو مواد جہاں سے لیا ہے اس کی تصحیح حوالے کے ذریعے درج کر دیتے ہیں۔ یہ چیز ان کے تفسیری انداز میں ایک اعلیٰ درجہ کا حسن پیدا کر دیتی ہے۔

تفہیم القرآن کے مآخذ و مصادر پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مولاناؒ نے ان کتابوں سے استفادہ کیا جو علم و تحقیق کی رُو سے اعلیٰ درجہ کی حامل ہیں اور ان کتابوں کے حوالوں سے گریز کیا ہے جو ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے ان تفاسیر سے مدد لی ہے جو فقہی، لغوی، نحوی، عارفانہ اور کلامی طرز کی ہیں۔ اس کے علاوہ کتب حدیث اور ان کی شرحوں کے حوالے خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخ و سیرت سے متعلق (مغازی محمد بن اسحاقؒ و موسیٰ بن عقبہ)، سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد، الاستیعاب، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، تاریخ الکامل (ابن اثیرؒ)، تاریخ ابن خلدون، تاریخ بغداد، دلائل النبوۃ (بیہقیؒ اور اصفہانی)، کتاب المحبر، الملل والنحل، تاریخ طبری، معجم البلدان، جوامع السیر، البدایہ والنہایۃ، فتح الباری، اسد الغابۃ، فتوح البلدان وغیرہ) سے لیا گیا کافی مواد موجود ہے۔ تفسیر کے معانی و مفاہیم میں عربی لغت (لسان العرب، القاموس المحیط اور أقرب الموارد وغیرہ) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ فقہی احکام کے سلسلے میں کتب فقہ (کتاب الخراج (امام ابو یوسف، یحییٰ بن آدم)، المبسوط، ھدایہ، فتح القدیر، بدائع الصنائع (علاؤ الدین کاسانیؒ اور مسعود کا

سائیؒ)،المنھاج ،المحتاج فی شرح المنھاج ،شرح المغنی المحتاج ،بدا یة المجتھد ،منتھی الغایة شرح الھدایة ،المغنی فی شرح الخرقی،الا نصاف، المحلّٰی، العقیدة الطحاویة ،الفقه علی المذاھب الاربعة، مناقب الإمام ابو حنیفة،السیر الکبیر ،الأشباہ و النظائر، کتاب الأم ،المدوّنة،الأموال، الاحتجاج، شرح الفقه الاکبر ،فتاوی عالم گیری،وغیرہ سے جو اقتباسات درج کیے ہیں ان کا بھی حوالہ نقل کیا ہے۔تفہیم القرآن میں جن انگریزی کتابوں کو بطور مآخذ و مصادر استعمال کیا گیا ہے ان میں سے کچھ کے نام درج کیے جا رہے ہیں: بائبل،(عربی،اردو انگلش)، تلمود(Pul Isaac Hershon Lodon'H.Polono)، دیگر انسائیکلو پیڈیا (Encyclopedia Of Islam'Jwish ' Britanica ' Biblica Literature،) Study of History ' Arabia and the Isles ' AbrahamAArabian Highlands) 'The Empty Quarter' The Unveiling Of Arabia' Discovries In Aasia Minor ' Decline and Fall of Roman Empire' Meraculorum Liber' Book Of The Himyarities 'Economist Of London)اور انگریزی کتب (Bernabas' Gosple'Holy Scriptures) کے حوالے بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔جدید علوم سے استفادہ کے سلسلے میں جدید سائنسی اور تاریخی کتب سے جو اقتباسات لیے گئے ہیں، ان کا بھی حوالہ درج کیا ہے،تا کہ کسی شک وشبہہ کا امکان باقی نہ رہے۔

فی ظلال القرآن میں مصادر و مآخذ کی نشان دہی بہت کم ملتی ہے ۔اس کے علاوہ سید صاحبؒ نے مشہور ومعروف عربی تفاسیر سے کم استفادہ کیا ہے۔تفسیر بیضاوی، تفسیر ابن کثیر،تفسیر طبری،الفوز الکبیر،مفاتیح الغیب،الکشاف اور امام ابن العربیؒ اور ابوبکر جصاص کی احکام القرآن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔

سید قطب نے جدید علماء میں استاذ محمد عبدہ کو مختلف جگہوں پر نقل کیا ہے اور استاذ امین الخولی کے طریقۂ درس کو پسند کیا ہے۔ حدیث کے حوالے بھی فی ظلال

القرآن میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔سورۂ بقرہ میں بخاری ،مسلم ،ترمذی کے حوالے ۳۵ مقامات پر پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ نسائی ،اصحاب السنن ،کے بھی حوالے اسی تعداد میں ملتے ہیں،طبرانی ،مصابیح السنۃ،مسند احمد اور مشکوٰۃ المصابیح کے حوالے چھ سات جگہوں پر ہیں۔اس کے علاوہ تاریخ میں سیرت ابن ہشام، زادالمعاد (ابن القیمؒ)،رحمۃ للعالمین (قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ)،البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیرؒ) تاریخ عمر بن الخطاب (ابن الجوزیؒ)،مقدمہ ابن خلدون، سیرت مغازی محمد بن اسحاقؒ،وغیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ بائبل کے حوالے عربی تورات سے دیے گئے ہیں، خصوصاً انجیل کے حوالے زیادہ تعداد میں ملتے ہیں، آثارِ قدیمہ ،اثری انکشافات، مارکسزم،سود، کمیونزم اور سائنس کے موضوعات پر ان کتابوں کے حوالے دیے ہیں: **الانسان بین المادیۃ و الا سلام ،اللہ والعلم الحدیث** ،مصنفہ استاذ عبدالرزاق نوفل،**العلم یدعوا الی الایمان** ، مذہب اور سائنس از عبدالباری (بحوالہ ماڈرن بلیف)، جدید سائنس دانوں کی تحقیق میں امریکی ماہرین: کارل مارکس اور سر جیمس کا نظریۂ تحقیق کو پیش کیا ہے مثلاً: سبرٹ آرنلڈ کی کتاب (پریچنگ آف اسلام)، 'Man Does Not Stand Alone''BY''A Cressy Morrison London'' تیسویں پارہ میں ان تصنیفات کے بھی اقتباسات نقل کئے ہیں۔اس طرح یہ تفسیر علوم و معارف کا خزانہ بن گئی ہے۔

فی ظلال القرآن میں انگریزی زبان میں موجود قرآنی اور اسلامی مواد سے استفادہ تو ملتا ہے،مگر کم تعداد میں۔اس کے باوجود اس تفسیر کا اندازِ تحریر علمی، مدلل اور فکر انگیز ہونے کے باعث وہ جدید ذہن کے لوگوں کے لیے تاثیر کا خاصا مواد رکھتی ہے۔

حواشی ومراجع

۱- تفہیم القرآن ،جلد اول ،سورہ المائدہ ،ص ۴۴۷

۲- حوالہ سابق ،جلد سوم ،سورہ الشعراء ،ص ۴۸۸ ،سورہ طٰہٰ ،ص ۹۱

۳۔ حوالۂ سابق، جلد سوم، سورہ طٰہٰ، ص ۱۱۵، ۱۱۶

۴۔ فی ظلال القرآن، حوالۂ سابق، پہلا ایڈیشن، پارہ عم، ص ۱۹۰

۵۔ تفہیم القرآن، حوالہ بالا، جلد اول، سورہ البقرہ، ص ۱۹۸۔۱۹۹

۶۔ حوالۂ سابق، جلد سوم، سورہ الانبیاء، ص ۱۵۶

۷۔ حوالۂ سابق، جلد چہارم، سورہ یٰس، ص ۲۶۱

۸۔ فی ظلال القرآن، حوالہ سابق، الجزء الثانی، ص ۴۰۔۴۱

۹۔ حوالۂ سابق، ص ۴۱

۱۰۔ حوالۂ سابق، ص ۴۲

۱۱۔ حوالۂ سابق، ص ۴۲۔۴۳

۱۲۔ تفہیم القرآن، حوالۂ سابق، جلد اول، سورہ الانعام، ص ۵۵۳۔۵۵۴

۱۳۔ حوالۂ سابق، جلد سوم، سورہ الکہف، حاشیہ ۹، ضمیمہ نمبر ا، ص ۶۹۷

۱۴۔ فی ظلال القرآن، حوالۂ سابق، الجزء الثلاثون، پارہ عم، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۱۵۔ تفہیم القرآن، حوالہ بالا، جلد اول، سورہ النساء، ص ۴۲۲

۱۶۔ حوالۂ سابق، جلد اول، سورہ البقرہ، ص ۲۱۱

۱۷۔ حوالۂ سابق، جلد سوم، سورہ النمل، ص ۵۷۳

۱۸۔ فی ظلال القرآن، حوالۂ سابق، پارہ عم، ص ۲۳۷

۱۹۔ حوالۂ سابق، ص ۴۰۔۴۱

۲۰۔ حوالۂ سابق، ص ۸۶

۲۱۔ تفہیم القرآن نمبر، ہفت روزہ آئین لاہور، ۱۵ دسمبر ۱۹۷۲ء، جلد ۱۱، شمارہ ۷، ص ۱۱۳

تہذیب و سیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

(مقالات سمینار)

مرتبین: ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی/مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی طرف سے منعقدہ سمینار کے مقالات کا مجموعہ، جس میں تحریک اسلامی ہند کے اکابرین اور قائدین کے خطبات کے علاوہ ملک کے ممتاز مفکرین اور دانش وروں کے کل ۳۶/ مقالات شامل ہیں۔ ان مقالات میں تہذیب و سیاست کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، جن میں مغربی اور اسلامی تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی، ان کے درمیان موجود فرق و امتیازات، تہذیبوں کے تصادم کا موجودہ نظریہ، امت مسلمہ کی موجودہ تہذیبی و سیاسی صورت حال، قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں حکومت و سیاست کے تصورات، موجودہ طریقۂ انتخاب، پارلیمانی نظامِ حکومت، تکثیری معاشرے کے مسائل جیسے اہم مباحث اور معروف علمائے سلف اور جدید مفکرین کی وقیع کتب کے تجزیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔

یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو قوم وملت کی علمی رہ نمائی اور موجودہ پیچیدہ حالات کے تقاضوں کے فہم و ادراک اور اس کی روشنی میں اپنے لائحۂ عمل کے تعین میں ممدو معاون ثابت ہوگی۔ کل صفحات ۸۳۶، قیمت: ۶۰۰ روپے صرف

ملنے کے پتے

☆ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

☆ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی ، نبی نگر، جمال پور، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

قرآنِ مجید کا تصوّرِ امن

(انسدادِ دہشت گردی کے عالمی قوانین کے پس منظر میں)

مولانا محمد جرجیس کریمی

۱۱/۹ کے بعد امریکہ نے دہشت گردی کو ایک جرم کے بجائے جنگ کا نام دیا اور اس کے خلاف دنیا بھر میں جنگ کا بگل بجانے کے ساتھ ملکی اور بین الاقوامی قوانین کو بالکلیہ نظر انداز کر دیا اور دو مسلم ملکوں: افغانستان اور عراق پر فوج کشی کر دی۔ تمام مغربی ممالک میں دہشت گردی کے خلاف قانون سازی کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ محض شبہہ کی بنیاد پر گرفتاریاں، ملک بدری، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھوں لوگوں کا اغوا، تفتیش میں توہین آمیز سلوک، حق دفاع سے محرومی، دوسرے ممالک کی حاکمیت اور آزادی کی پامالی، قومی مفادات کے تحفظ کے نام پر فوج کشی، بم باری اور سرحدوں کے عالمی ضابطوں کی خلاف ورزی کا راستہ اختیار کیا گیا۔ پہلے تو عالمی برادری ان اقدامات کو خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہی، مگر دہشت گردی کے خلاف مزعومہ جنگ جوں جوں طول کھینچ رہی ہے اس کے خلاف آواز اٹھنے لگی ہے۔ ۲۰۰۹ء میں جنیوا میں قانون دانوں کے عالمی کمیشن کے آٹھ رکنی پینل نے ایک سو پچاس (۱۵۰) صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ اس پینل کی سربراہی آئر لینڈ کی سابق صدر اور اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کی ہائی کمشنر میری رابن سن (Marry Robin son) کر رہی تھیں۔ اس کے دوسرے شرکاء میں دنیا کے کئی ماہرین قانون اور سابق جج تھے۔ اس رپورٹ میں ان قوانین پر بھر پور گرفت کی گئی ہے جو دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں اور جن کی زد بین الاقوامی قانون کے مسلمہ اصولوں پر پڑ رہی ہے۔ رپورٹ میں دہشت گردی کو جنگ نہیں، بلکہ جرم اور انسانیت کے لیے خطرہ سے تعبیر کیا گیا ہے، ساتھ ہی یہ بات بھی واضح

کر دی گئی ہے کہ اس کے انسداد کے نام پر قانون اور بنیادی حقوق کے تحفظ کے مسلّمہ اصولوں سے انحراف کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ذیل میں اس رپورٹ کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ان سے انسداد دہشت گردی کے قوانین کا بھی پتا چلتا ہے اوران کی خامیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے:

''دہشت گردی ایک حقیقت ہے اور اس سے جو خطرات درپیش ہیں ان کو خفیف سمجھنا ایک غلطی ہوگی۔ان خطرات کا مقابلہ ریاستوں کا فرض ہے۔مگر دہشت گردی کی مخالفت کے نام پر کیے جانے والے موجودہ متعدد اقدامات نہ صرف غیر قانونی ہیں، بلکہ ان کے منفی نتائج رونما ہو رہے ہیں۔ پینل اس نتیجے تک پہنچا ہے کہ ان کی وجہ سے انسانی حقوق کے قوانین کی بنیادوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ اندازے سے بہت زیادہ ہے۔ دہشت گردی مخالف قوانین، پالیسیوں اور طریقوں کا جائزہ لینے اور جو نقصان ہوا ہے اس کا تدارک کرنے کے لیے عالمی، علاقائی اور قومی سطحوں پر اقدامات کی فوری ضرورت ہے۔

بہت سی ریاستیں خود اپنے معاہداتی اور روایتی قانون کے تقاضوں سے منحرف ہو رہی ہیں۔ اس طرح ایک خطرناک صورت پیدا ہوگئی ہے، جس میں دہشت گردی اور اس کے خوف نے عالمی حقوق انسانی کے بنیادی قانون (بشمول پہلے سے طے شدہ اصول: ٹارچر، ظالمانہ اور غیرانسانی توہین آمیز سلوک، افراد کا اغوا اور غیر منصفانہ مقدمات کی ممانعت) کو پامال کر دیا ہے۔

لبرل جمہوری ریاستیں ماضی میں انسانی حقوق کے اصولوں کا دفاع کرتی رہی ہیں، مگر اب وہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کر کے عالمی قانون کو رفتہ رفتہ کم زور کر رہی ہیں۔ یہ حکومتیں دوسری حکومتوں کی ان کارروائیوں میں، جو حقوق کی پامالی کا موجب ہیں، شریک ہیں، یا کم از کم خاموش رہ کر ان کی ساتھی بن رہی ہیں۔

دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج داری قانون ہی مقابلے کا اولین ذریعہ ہونا چاہیے۔پینل کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں نے دہشت گردی کی

دھمکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مروجہ قوانین وضوابط اور آزمودہ طریقوں سے احتراز کیا ہے۔ تاہم اگر ریاستوں کو عوام کی زندگی اور سلامتی کے تحفظ کی ذمہ داری ادا کرنا ہے تو دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے مروّجہ فوج داری عدالتی نظام ہی اولین فریم روک ہونا چاہیے۔

۱۱/۹ کے بعد بہت سے قوانین اور پالیسیوں کو مثلاً غیر متعین مدت کے لیے بلا مقدمہ حراست اور فوجی عدالتوں وغیرہ کے ذریعے استعمال کیا جا رہا ہے، حالاں کہ ان کو ماضی میں بھی آزمایا جا چکا ہے اور وہ اکثر وبیش تر ناکام رہے ہیں۔ غیر معمولی خطرے کی وجہ سے ریاستوں کو تاریخی مثالوں سے سبق سیکھنے کی طرف آنکھیں بند نہیں کر لینا چاہیے۔ مثال کے طور پر یہ نہایت ضروری ہے کہ ایک آزاد سویلین عدلیہ برقرار رکھی جائے، جو دہشت گردی کے خلاف اقدامات پر جواب دہی کو یقینی بنائے۔

ریاستوں نے احتیاطی تدابیر مثلاً ملک بدری، پابندیوں کے احکام، دہشت گرد افراد اور تنظیموں کی فہرست پر انحصار بڑھا دیا ہے۔ پینل کو تشویش ہے کہ غیر مصدّقہ شواہد اور ناقص خفیہ معلومات کو افراد اور تنظیموں کے خلاف اقدام کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، جس کے بڑے تباہ کن اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ نیز پینل کو اس نوعیت کے اقدامات کے خلاف مؤثر اپیل کا مناسب طریقہ فراہم نہ ہونے پر بھی تشویش ہے۔

پوری دنیا میں خفیہ ایجنسیوں نے نئے اختیارات اور وسائل حاصل کر لیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ قانونی اور سیاسی جواب دہی کا جو اہتمام ضروری ہے وہ مفقود ہے۔ پینل اس نتیجے تک پہنچا ہے کہ قابل اعتماد خفیہ معلومات ضروری ہیں، لیکن ساتھ ہی جواب دہی بھی ضروری ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ عالمی خفیہ اداروں کے باہمی تعاون کے لیے واضح پالیسیاں اور طریق کار طے کیے جائیں۔

بہت سی ریاستوں میں مشتبہ دہشت گردوں کی حراست اور تفتیش پر راز داری کا پردہ پڑا ہوا ہے، جس سے ٹارچر، ظالمانہ، غیر انسانی اور توہین آمیز طریقوں کو راستہ ملتا ہے، جب کہ ایسی خلاف ورزیوں پر سزا کا خوف بھی نہ ہو۔ عدالتوں اور وکلاء تک تیز رفتار اور مؤثر رسائی ممکن بنائی جانی چاہیے، تا کہ اس قسم کی قانونی خلاف ورزیوں سے

نجات مل سکے۔

امریکہ کی قیادت میں وار آن ٹیرر نے عالمی انسانی حقوق کے بنیادی اصولوں اور انسان دوست قانون (Humanitarian Law) کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ امریکہ کو استحصال پر مبنی قوانین، پالیسیوں اور طریقوں کو، جو دہشت گردی کے خلاف جنگ سے وابستہ ہیں، واضح طور پر مسترد کرنا چاہیے۔ ماضی کی خلاف ورزیوں پر ایک شفاف اور جامع تحقیقات کروانی چاہیے اور متاثر افراد کو مناسب تلافی دینا چاہیے۔''[۱]

دوسو پچاس (۲۵۰) صفحات پر مشتمل رپورٹ کے یہ اہم نکات ہیں۔ ان سے انسداد دہشت گردی سے متعلق عالمی قوانین میں موجود خامیوں کا پتا چلتا ہے اور ان قوانین کا بھی جو ۱۱/ ۹ کے بعد وضع کیے گئے ہیں۔ ذیل میں اسی رپورٹ کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

فتنہ وفساد کے خاتمے کا الٰہی قانون

اللہ تعالیٰ اس کائنات کا مالک حقیقی ہے۔ وہ دنیا میں امن وسلامتی چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بے قصور بندوں کو ہدفِ ستم بنایا جائے۔ طاقت ور کم زوروں کا حق ماریں اور ان کا جینا دوبھر کر دیں۔ دنیا میں ظلم وفساد اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو اور لوگوں پر جبراً اپنی مرضی مسلط کی جائے، دھن دولت، لالچ، ہوس، جہاں گیری اور کشور کشائی کے لیے انصاف کا خون بہایا جائے۔ چنانچہ ایک طرف اللہ تعالی نے انسانی جان کو محترم ٹھہراتے ہوئے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے (المائدۃ:۳۲) اور حکم دیا گیا ہے کہ جس جان کو اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے اسے قتل نہ کرو۔ دوسری طرف فتنہ وفساد کو قتل سے بڑھ کر سنگین جرم قرار دیا ہے۔(البقرۃ:۱۹۱)

ان آیات کے پس منظر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''اس ناگزیر خون ریزی کے بغیر نہ دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے، نہ شروفساد کی جڑ کٹ سکتی ہے، نہ نیکوں کو بدوں کی شرارت سے نجات مل سکتی ہے، نہ حق دار کو حق مل سکتا ہے، نہ ایمان داروں کو ایمان اور ضمیر کی

آزادی حاصل ہوسکتی ہے، نہ سرکشوں کو ان کے جائز حدود میں محدود رکھا جا سکتا ہے اور نہ اللہ کی مخلوق کو مادی و روحانی چین میسر آ سکتا ہے۔''۲

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں برپا فتنہ وفساد کا ازالہ مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ کبھی وہ ایک گروہ کو دوسرے سے دور کر کے تمام انسانوں کو ظلم وزیادتی سے نجات دلاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَوْلاَ دَفْعُ اللّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الأَرْضُ وَلَـكِنَّ اللّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (البقرۃ:۲۵۱)

''اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی، مگر دنیا والوں پر اللہ بڑا فضل والا ہے۔''

کبھی وہ لوگوں کے درمیان بھڑکنے والے شعلۂ جنگ وجدال کو اپنی ربوبیت کی تدابیر کے ذریعہ سرد کرتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

كُلَّمَا أَوْقَدُواْ نَاراً لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَاداً وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (المائدۃ:۶۴)

''یہ لوگ جب بھی جنگ اور خون ریزی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔ یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔''

قرآن میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو عبادت گاہیں تک محفوظ نہ رہتیں اور وہ منہدم کر دی جاتیں، مگر اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں کے خلاف کھڑا کر دیتا ہے، تاکہ فساد رک جائے۔ (الحج:۴۰)

دہشت گردی جرم ہے، جنگ نہیں

جو لوگ دہشت گردی پھیلانے کے لیے معصوم شہریوں کی جانیں لیتے ہیں، ان کے ساتھ خطرناک مجرموں جیسا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔ ان کو وہ مقام ہرگز نہیں دیا جانا چاہیے، جو ان جنگجوؤں کا ہوتا ہے جو ریاستوں سے برسرِ جنگ ہوں۔ دہشت گردی کے

خلاف جنگ کی نوعیت بھی یہی ہے۔ بین الاقوامی قانون کا ماہر برطانیہ کا قانون داں کوئیس کونسل جیفرے رابرٹسن اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:

''ایک احساس یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون ناکام ہو چکا ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ ۱۵ کا اطلاق صرف ان حملوں پر ہوتا ہے جو دوسری ریاستیں کریں نہ کہ دہشت گرد گروپ۔ کسی نے بھی اب تک جنگ اور قانون کے اس معاملے پر دہشت گردی کا اطلاق کرنے کا نوٹس نہیں لیا۔ جنیوا کنونشن اور معمول کے حقوق کا دہشت گرد اور قانون نافذ کرنے والے پر یکساں اطلاق ہونا چاہئے۔''[۳]

قرآن مجید نے دہشت گردانہ افعال کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا ہے اور اس کے انسداد کے لیے تمام ممکن وسائل و ذرائع اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے:

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الْأَرْضِ (المائدۃ:۳۳)

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس کے لیے تگ ودو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ پیر مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا جلاوطن کر دیے جائیں۔''

فقہی اصطلاح میں آیت بالا میں ڈکیتی کی سزا بیان کی گئی ہے، مگر موجودہ پس منظر میں اس کا اطلاق دہشت گردوں پر بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں سخت ترین سزا بیان کی گئی ہے، لیکن اس کا دائرہ مجرمین تک محدود ہے۔ قانون کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ کسی فرد یا ریاست کو کسی اور کے جرم کی پاداش میں سزا نہیں دی جا سکتی۔ انٹرنیشنل لا کمیشن نے اس سلسلے میں واضح قوانین وضع کیے ہیں، جنہیں دنیا کے تمام ممالک بشمول امریکہ و برطانیہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس قانون کی دفعہ ۱۱ کے مطابق فرد یا گروہ کا ایسا طرزِ عمل جو کسی ریاست کی جانب سے نہ ہو، بین الاقوامی قانون کے تحت ریاست کا اقدام نہیں سمجھا جائے گا۔

قرآن مجید دوسری قوموں سے کیے گئے معاہدوں کی پاس داری کی تلقین کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ جو معاہدہ ہو، لفظ و معنیٰ کے پورے احترام کے ساتھ اس کی پابندی کی جائے، حتیٰ کہ جنگی حالات میں بھی صلح کو ترجیح دی جائے۔ اگر دشمن صلح کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس سے صلح کر لی جائے اور اس وہم کو دل میں جگہ نہ دی جائے کہ اس طرح وہ ہم کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ ہو اور وہ قوم اپنے یہاں کے مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہی ہو تو اس کے خلاف جنگ چھیڑنا درست نہیں ہوگا، جب تک کہ معاہدے کو ختم کرنے کا اعلان نہ کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَإِن يُرِيدُواْ أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّهُ هُوَ الَّذِيَ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ (الانفال:۶۱۔۶۲)

''اور اے نبی! اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر وہ دھوکہ کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لیے اللہ کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاء إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبُّ الخَائِنِينَ (الانفال:۵۸)

''اور اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو۔ یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔''

شبہات کی بنیاد پر جرم ثابت نہیں ہوگا

دنیا کا ایک مسلّمہ قانون یہ ہے کہ اگر کسی پر الزام لگایا جائے تو جب تک وہ الزام ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا اور اسے سزا کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا۔ کسی کو پھانسی دینے سے پہلے عدالت میں اس کا جرم ثابت کرنا ہوگا۔ افغانستان کا جرم نہ دنیا کے سامنے لایا گیا، نہ بین الاقوامی عدالت میں اسے ثابت کیا جا سکا، بلکہ اسے پیش ہی نہیں کیا گیا، اس کے بغیر اس کے خلاف فوج کشی کر دی گئی، جس کے نتیجے میں

لاکھوں کی تعداد میں عام آبادی، معصوم بچے، عورتیں، بوڑھے اور مریض ہلاک ہوئے۔

امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر نہ صرف افغانستان کو تاراج کر دیا، بلکہ اس نے مختلف ممالک میں ڈرون حملوں کے ذریعہ وہاں کی عام آبادی کو نشانہ بنایا، چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے۔ بہت پہلے امریکی ادارے American Civil Liberties Union نے اپنی ایک رپورٹ میں اس امر کا اظہار کیا تھا کہ یمن، صومالیہ اور پاکستان میں امریکہ ڈرون حملوں کے نتیجے میں ۴ ہزار سے زیادہ افراد مارے گئے ہیں اور ہلاک ہونے والوں میں بڑی تعداد شہریوں کی ہے۔ محض شبہ کی بنیاد پر یا لباس اور داڑھی کے جرم میں امریکہ کی نگاہ میں مشتبہ علاقوں میں کسی بھی ایسے مرد یا مردوں کے اجتماع کو ہدف بنایا جا سکتا ہے جو ۱۵-۶۰ سال کی عمر کا ہو۔[۴]

قرآن مجید میں تمام فوج داری جرائم میں جرم کو ثابت کرنے کے لیے گواہی کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاء فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَداً وَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْن (النور:۴)
>
> ’’اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسّی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت بھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں‘‘۔

الزامِ زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی شرط رکھی گئی اور الزام ثابت نہ ہونے پر اسّی (۸۰) کوڑے کی سزا متعین کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دہشت گردی کے اثبات کے لیے کتنی سخت شرائط ہونی چاہئیں۔

بے گناہوں کو طویل عرصے تک قید رکھنا

مغرب نے حقوق انسانی اور آزادی کا جتنا چرچا کیا اس کے مقابلے میں اس نے حقوق پامال کیے اور آزاد انسانوں کو قید خانوں میں برسوں ڈالے رکھا۔ اس کی تازہ

مثال گوانتانا موجیل کے بے گناہ قیدی ہیں، جنہیں عرصہ تک مقیّد رکھا گیا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا نہ رہا کیا گیا۔ مجموعی طور پر چالیس پینتالیس ملکوں کے سیکڑوں قیدیوں کو وہاں بند رکھا گیا۔

قرآن مجید روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے حقوق کی پاس داری کی یکساں تعلیم دیتا ہے۔ انسانی جان کی حرمت کو وہ سب کے لیے یکساں طور پر ہمیشہ اور ہر جگہ تسلیم کرتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعا (المائدۃ:۳۲)

''جو کوئی کسی نفس کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، یا زمین میں فساد پھیلایا ہو تو اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی نفس کو زندہ رکھا گویا اس نے سب انسانوں کو زندہ کیا''۔

مساوات کو انسان کا بنیادی حق ہی نہیں، بلکہ تمام حقوق کی اصل کہا جا تا ہے۔ حقوق انسانی کے عالمی منشور میں جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ حقوق سب کو یکساں حاصل ہوں گے، ان میں نسل، رنگ، جنس (مرد اور عورت)، زبان، مذہب، سیاسی یا دیگر افکار و خیالات، سماجی و معاشی حیثیت اور جائے پیدائش کی بنیاد پر فرق و امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ قرآن مجید نے انسانوں کے درمیان مساوات کے اصول کو نہ صرف تسلیم کیا، بلکہ امتیاز و تفریق کی تمام بنیادوں کی بیخ کنی کردی۔ فرعون کے بارے میں قرآن نے کہا:

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعاً يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (القصص:۳)

''بے شک فرعون نے ارض مصر میں سرکشی کی راہ اختیار کی اور وہاں کے باشندوں کو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں بعض ایک فرقہ (بنی اسرائیل) کو کم زور بنائے رکھتا، ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا۔ بے شک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔''

انسانوں کے درمیان مساوات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب کے ساتھ عدل وانصاف ہواور کوئی بھی شخص ظلم وزیادتی کا ہدف نہ بننے پائے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید:۵۲)

''ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اوران کے ساتھ کتاب اورمیزان نازل کی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں''۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (المائدہ:۸)

''کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر ہرگز آمادہ نہ کرے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے اس سے باخبر ہے''۔

اسلامی قانونِ شہادت کے تحت کسی شخص کو قید و بند کی سزا اس وقت دی جائے گی جب قابل اعتماد شہادتوں سے ثابت ہوجائے کہ واقعتاً اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے اوراس سزا کا مستحق ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے ان مظالم کا حوالہ دیا گیا ہے جو وہ ایک دوسرے کے خلاف کرتے تھے۔ وہ ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے، انہیں قید کرتے، پھران سے فدیہ وصول کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے اور اسے میثاق الٰہی کو توڑنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ (البقرۃ:۸۳-۸۵)

انسانیت سوز سزائیں دینا

گزشتہ برسوں میں عالمی ذرائع ابلاغ نے ابوغریب (عراق) اور گوانتانا موبے کے قید خانوں میں قیدیوں کی تذلیل وتوہین اور انسانیت سوز ٹارچر کے جو مناظر دکھائے تھے، وہ روح فرسا، اذیت ناک اور خون کے آنسو رلانے والے تھے۔ قیدیوں کو مادر زادننگا کر کے انہیں ایک دوسرے پر ایسے ڈھیر کردیا جاتا تھا، جیسے وہ انسان نہیں کوڑا کرکٹ ہوں۔ ننگے قیدیوں کو زنجیروں کے ذریعہ دیوار سے باندھ کران پر کتّے چھوڑے

جاتے تھے اور ان کی بے بسی پر قہقہے لگائے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ جنسی حرکات کرتے ہوئے تصویر کشی کی جاتی تھی۔ گوانتا نا موبے کے قیدیوں کو خاص طور سے گز بھر مربع جگہ میں رکھا گیا اور ان کے چاروں طرف خار دار تاروں میں بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا گیا۔ ان جیلوں میں کیا کچھ ہوا اس کی محض چند جھلکیاں ہی مہذب دنیا کے سامنے آسکیں، ورنہ بہت کچھ پردۂ خفا ہی میں رہا۔[۵]

قرآن مجید میں حدود و قصاص کے ضمن میں بعض سزاؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن پر مغرب نے ہمیشہ اعتراضات کیے اور ان کو حقوق انسانی کے خلاف باور کرانے کی کوشش کی، مگر دہشت گردی کے انسداد کے نام پر اس نے ایسی ایسی سزائیں ایجاد کی ہیں کہ خدا کی پناہ! بہر حال قرآن مجید ایسی سزاؤں کی کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دیتا۔ قرآن مجید میں حدود و قصاص کے ضمن میں واضح اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان کا نفاذ متعین طور پر صرف مجرموں پر ہوتا ہے۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مشتبہ افراد کو غیر متعینہ مدت تک انسانیت سوز سزائیں دی جاتی رہیں۔

قرآن مجید میں جس جرم پر متنوع سزاؤں کا تذکرہ ہے، وہ ڈکیتی ہے۔ اس کی سزا مختلف صورتوں میں بیان ہوئی ہے، مثلاً قتل، سولی، مخالف سمتوں سے ہاتھ اور پیر کاٹ دینا اور شہر بدر کرنا۔ اس ضمن میں فقہاء نے لکھا ہے کہ ڈکیتی کی جس طرح مختلف شکلیں ہیں، اسی طرح اس کی سزائیں بھی بیان کی گئی ہیں: جس نے صرف دہشت پھیلائی ہو اسے شہر بدر کیا جائے گا۔ جس نے صرف مال لوٹا ہو اس کے ہاتھ اور پیر مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں گے۔ جس نے قتل کا ارتکاب کیا ہو، لیکن مال نہ لوٹ سکا ہو، اسے قتل کر دیا جائے گا اور جس نے قتل بھی کیا ہو اور مال بھی لوٹا ہو تو اسے پھانسی دی جائے گی۔[٦]

ڈکیتی کی اس طرح کی متنوع سزاؤں کے باوجود قرآن نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ اگر مجرم گرفت میں آنے سے پہلے توبہ کر لے تو اس سے سزا ساقط ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِلَّا الَّذِينَ تَابُواْ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُواْ عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ

غَفُورٌ رَّحِيم (المائدۃ:۳۴)

(مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔)

اسلام میں ارتداد کی سخت سزا رکھی گئی ہے، یعنی قتل، مگر اس کے باوجود اس کو توبہ کی مہلت دی جائے گی۔ اگر وہ توبہ کرلے تو اسے کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مجرم اگر اصلاح پر آمادہ ہو تو اسے اس کا موقع دیا جائے گا۔ جن مجرمین پر سزا کا نفاذ ہونا ہو ان کی تذلیل وتحقیر کی اجازت نہیں دی گئی ہے، بلکہ جو متعین سزا (حدود یا قصاص) بیان کی گئی ہے صرف وہی نافذ کی جائے گی۔ یہ سزائیں صرف ان لوگوں پر نافذ کی جائیں گی جو حقیقت میں مجرم ہوں اور جرم ثابت کرنے کے لیے تمام عدالتی کارروائیاں پوری غیر جانب داری کے ساتھ انجام پائی ہوں اور جرم اپنے جملہ شرائط کے ساتھ ثابت ہو چکا ہو لیکن اگر ثبوت میں کسی بھی پہلو سے اشتباہ ہو تو یہ سزائیں نافذ نہیں ہوں گی، البتہ ریاست کو مجرم کی تعزیر کا حق ہے۔

تصور امن اور اخلاقیات

امن کے اصل معنیٰ نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے امانت ہے، جو خیانت کی ضد ہے۔ امین کو امین اس لیے کہا جاتا ہے، کہ اس کی نیک معاملگی پر دل مطمئن ہوتا ہے۔ جو اونٹ قوی اور مضبوط جسم کا ہو اسے 'مامون' کیا جاتا ہے، کیوں کہ وہ وضعف سے محفوظ ہوتا ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی نیند کے لیے قرآن مجید نے 'اَمَنَةً نُعَاسًا' کا الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کے معنیٰ ہیں ایسی نیند جس سے دماغ کو راحت وسکون اور دل کو اطمینان حاصل ہو۔ امن خوف کی ضد ہے، یعنی مستقبل میں کسی بھی ناخوش گوار واقعہ سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی سے مستامن ہے، جس کا اطلاق اس حربی پر ہوتا ہے جو اسلامی حکومت سے امان نامہ حاصل کر کے دارالاسلام میں بے خوف ہو کر رہتا ہو۔ گویا امن ایسے حالات کا نام ہے جن میں ہر شخص یا فریق اپنے تحفظ کے سلسلے میں دوسرے کی طرف سے بالکل بے خوف اور مطمئن ہو۔ سلم، سلام اور اسلام کے الفاظ کا استعمال امن کے مترادف کے طور پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں فرد کی تربیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، تا کہ وہ مرضیٔ رب اور امن وسلامتی کی راہ پر گام زن ہو سکے۔ اسلام امن وسلامتی انفرادی اور سماجی سطح پر ہی نہیں، بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی قائم کرنا چاہتا ہے، تا کہ ہر متنفس اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ یہی اسلامی تعلیمات کا بنیادی مقصد ہے۔ قرآن مجید میں مختلف اخلاقی اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً ذکر، شکر، تقویٰ، توکل، صبر، توبہ واستغفار، شرم وحیا، احسان، صداقت، خوش اخلاقی، ایفائے عہد، امانت، عدل وانصاف، تواضع، رحم دلی، عفوودرگزر، خیر خواہی، مساوات، وغیرہ۔ اسی طرح فضول خرچی، سود خوری، رشوت، بدکاری، کبر وغرور، جھوٹ، فریب، غصہ، خیانت، چوری، شراب نوشی، جوا وغیرہ سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگر افراد میں یہ اعلیٰ صفات پیدا ہوں اور ان صفات بد سے وہ اجتناب کریں تو ایک پرامن معاشرہ وجود میں آئے گا۔

اسلام کی رو سے سماج میں پائے جانے والے تمام طبقات اور گروہوں کے درمیان باہمی تعاون، رحمت ومحبت اور امن وسلامتی کا تعلق پایا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد حقوق وفرائض کے متوازن اور معتدل تصور پر قائم ہے۔ قرآن مجید میں حقوق وفرائض کی صرف قانونی دفعات ہی مذکور نہیں ہیں، بلکہ حقیقی معنوں میں لوگوں کے درمیان اخوت ومحبت پیدا کرنے کی تدابیر بھی بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ تمام اہل ایمان کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰)

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

سماج میں ایک دوسرے کے خلاف بغض ونفرت اور خوف وہراس پیدا کرنے کے ذرائع سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اظہارِ کبر، بے رخی برتنے اور کرخت آواز میں بات کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی تعلیم دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اس طرح دشمن بھی دوست بن سکتا ہے۔ (حم السجدۃ: ۳۴)

اصولی طور پر یہ بات بہت واضح انداز میں بیان کردی گئی ہے کہ باہمی تعاون

ہمیشہ اچھے، نیک، بھلائی اور خداترسی کے کاموں میں کیا جائے اور فتنہ وفساد، ظلم وزیادتی اور بغاوت وسرکشی کے کاموں میں ہرگز نہ کیا جائے۔(المائدۃ:۲)ایسے طبقات کی نشان دہی کی گئی ہے جو تقویٰ اور حسن سلوک کے مستحق ہیں اور جن کی ذہنی ومالی معاونت معاشرہ میں امن وامان کے قیام کا ذریعہ ہوتی ہے۔(الضحیٰ:۹-۱۰،الذاریات:۱۹)

اس حکم کے ساتھ تعاون باہمی کے موانع کا بھی سدّ باب کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر خود غرضی باہمی تعاون میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے ازالے کے لیے ایثار کا حکم دیا گیا ہے۔(الحشر:۹)خود غرضی کی سب سے نمایاں مثال سود ہے، اس لیے اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔(البقرۃ:۲۷۵)اس کے ساتھ ناپ تول میں کمی بیشی کو بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ (المطفّفین:۱-۳) کیوں کہ یہ سب چیزیں بدامنی پیدا کرتی ہیں اور اس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ایسے تمام افعال کو فساد فی الارض قرار دیا گیا ہے، جن سے لوگوں کے مال واسباب میں خسارہ ہوا۔(الشعراء:۱۸۳)

درج بالا تعلیمات قرآن مجید میں عام پیرایے میں بیان ہوئی ہیں،جن سے مخاطب افراد بھی ہیں اور جماعتیں بھی، لیکن قرآن مجید معاشرہ میں امن وسلامتی قائم کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی بھی تلقین کرتا ہے اور زمین سے فتنہ وفساد کے خاتمے کو پوری امت کی ذمہ داری ٹھہراتا ہے۔(آل عمران:۱۰۳)وہ مسلمانوں پر بحیثیت خیر امت یہ ذمہ داری بھی ڈالتا ہے کہ روئے زمین سے فتنہ وفساد کی ممکنہ تمام شکلوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے وہ جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیتا ہے۔(النساء:۷۵) اس کے ساتھ وہ حکومت اور قانون کو بھی بروئے کار لانے کی تاکید کرتا ہے، تاکہ تمام شہریوں کو سماجی اور سیاسی عدل وانصاف حاصل ہو اور امن وامان کا ماحول باقی رہے۔ (النساء:۵۸،الحدید:۲۵)اسلامی ریاست کے فرائض میں امن وامان کو یقینی بنانے کے لیے حدود وقصاص کے نفاذ کا حکم دیا گیا ہے۔حدود وقصاص کا نفاذ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے اور معاشرہ میں امن وامان کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے قصاص کو 'حیاۃ'(یعنی زندگی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسلام جس امن و امان کو انفرادی اور قومی سطح پر قائم کرنا چاہتا ہے اس کو وہ بین الاقوامی سطح پر بھی قائم ودائم دیکھنا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے لیے وہ عالمی طور پر مختلف اقوام سے امن معاہدات کرنے اور امن کی پابندیوں کو کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

یَأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ أَوْفُواْ بِالْعُقُود (المائدۃ:۱)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے عہد و پیمان پورے کرو۔)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَأَوْفُواْ بِعَهْدِ اللّهِ إِذَا عَاهَدتُّم (النحل:۹۱)

(اور اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو جب کہ تم اسے باندھ چکے ہو پورا کرو۔)

اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو انفرادی، قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر امن و امان کو فروغ ہوگا، افراد اپنے بنیادی حقوق سے بہرہ ور ہوں گے، ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے گا، ظالموں کی سرکوبی اور مظلوموں کی دادرسی ہوگی، اس طرح ایک پُر امن معاشرہ وجود میں آئے گا۔

حواشی و مراجع

۱۔ ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، پروفیسر خورشید احمد، اشارات بہ عنوان' وار آن ٹیرر کی دہشت گردی، مارچ ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۔۱۹

۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ص ۳۲۔۳۳

۳۔ ماہ نامہ ترجمان القرآن، پروفیسر خورشید احمد، اشارات بہ عنوان' میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں؟' ستمبر ۲۰۱۲، ص ۷، ۸

۴۔ حوالہ سابق

۵۔ ماہ نامہ افکار ملی نئی دہلی، وحید قیصر، بے گناہوں کا قید خانہ، جولائی ۲۰۰۴ء ص ۲۹

۶۔ ماہ نامہ افکار ملی نئی دہلی، غطریف شہباز ندوی، ہسپانیہ کے انکویزیشن سے گوانتانا موبے اور ابو غریب تک، جون ۲۰۰۴ء، ص ۲۴۔۲۶

۷۔ ابن قدامہ، المغنی، ملتبۃ الریاض الحدیثۃ، ۱۹۶۸ء، کتاب قطاع الطریق، ج ۸، ص ۲۸۹

ادارۂ تحقیق کی دو اہم مطبوعات

قرآن اور اہلِ کتاب

حکایت۔عبرت۔نصیحت

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب (یہود و نصاری) کے حالات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات، ان کی بد اعتقادیوں اور بد اعمالیوں کی تفصیلات اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں اور تنبیہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اہلِ کتاب کے اس مفصل تذکرہ کا مقصد کیا ہے؟اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت و نصیحت کے کون سے پہلو ہیں؟اور اس سے انہیں کیا رہ نمائی ملتی ہے؟اس کتاب میں ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری کا مبسوط مقدّمہ بھی ہے۔

صفحات:۳۰۴ قیمت=/۱۶۰روپے

توحید اور قیامِ عدل

مولانا محمد جرجیس کریمی

عقیدۂ توحید اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے، جس پر ایمان لانے سے انسانی زندگی میں نظم، توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے اور اس پر ایمان نہ لانے سے وہ بدنظمی، بے اعتدالی اور فساد کا شکار ہو جاتی ہے۔

پیش نظر کتاب چار مباحث پر مشتمل ہے، جن میں عقیدۂ توحید کی وضاحت کی گئی ہے، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اعتدال و توازن کے اثرات بیان کیے گئے ہیں، نیز عقیدۂ توحید سے محرومی اور شرک و الحاد میں آلودگی کے نقصانات اور افکار و خیالات پر پڑنے والے اثرات کا عالمانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات:۹۲ قیمت:۵۰/روپے

اقبال کا نظریۂ تعلیم اور دورِ جدید میں اس کی اہمیت و افادیت

ڈاکٹر علی محمد بٹ

علامہ اقبالؒ کے فکری اور علمی سرمایہ میں تعلیم اور تعلیم گاہوں کے حوالے سے خاصی گفتگو ملتی ہے۔ ان کے تعلیمی فلسفے میں عصری دانش گاہوں اور روایتی دینی مدارس دونوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے نظریۂ تعلیم کا مطالعہ کیا جائے، تاکہ روایت پسندی اور جدیدیت سے خلاصی حاصل ہو سکے۔

اقبالؒ کے تعلیمی نظام میں افراد کی تربیت اسلامی نقطۂ نگاہ پر منحصر ہے۔ اس لیے نفس کو قابو میں رکھنے کیے لیے افراد کی دینی تربیت ان کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ تزکیۂ نفس کو علامہ اقبال نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے ایک آزاد و خودمختار تعلیمی نظام کی اشد ضرورت ہے، جو دوسری قوموں کی تعلیمی ثقافت سے مغلوب ہو نہ تربیتی اصولوں سے عاری۔ ان کے نزدیک اسلام کا نظامِ تعلیم ایک با اخلاق اور انسان دوست شخصیت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جو خدا پرستی اور اعلیٰ اخلاقی زندگی کے لیے لازمی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جدید تعلیمی فلسفہ کا اسلامی علوم سے موزانہ کیا تو اُن کے ضمیر نے اُن کو یہ اعتراف کرنے کے لیے مجبور کیا کہ تعلق باللہ سے ہی انسان اس دنیا پر دست رس حاصل کر سکتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اقبال قرآن کو مشعل راہ اور انسانیت کی نجات کا باعث مانتے ہیں ۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار [۱]

علامہ اقبالؒ قرآن کو مسلم نظام تعلیم کے لیے روح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے بغیر مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کو ناممکن گردانتے ہیں۔ وہ قرآن اور تعلیم کو روح اور جسم کی طرح مانتے ہیں۔ جس طرح روح کے بغیر جسم کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اسی طرح انسان قرآن کے بغیر حیوان ہے۔ وہ قرآن اور اسوۂ رسول ﷺ کو روح کی غذا سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب تک روح حقیقت سے نا آشنا ہے، اس وقت تک انسان کے اندر کوئی تبدیلی ناممکن ہے۔

دور جدید میں نوجوان نسل کی روح اس لیے آلودہ ہے، کیوں کہ وہ خدائی تعلیم سے نا آشنا ہے۔ اس کے برعکس مغربی تعلیمی نظام نوجوان نسل کو ہوس پرست بنا دیتا ہے۔ اس نظریۂ تعلیم کو علامہ اقبالؒ نے رد کیا ہے اور اسلامی نظام تعلیم کے خلاف ایک سازش قرار دیا ہے ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف[۲]

علامہ اقبالؒ جس نظامِ تعلیم کے خواہاں ہیں اُس کا مرکز للٰہیت ہے، کیوں کہ یہ نفس پرستی سے نجات دلا کر انسان کو انصاف کے لیے کھڑا کر دیتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم انسان کی دلی کیفیت کو بدل کر اس کے اندر انسانی جذبات و احساسات پیدا کر دیتی ہے ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے، اسے پھیر
تاثیر میں اِکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر![۳]

علامہ اقبالؒ نے اسلامی علوم پڑھانے والوں کا مغرب زدہ لوگوں کے ساتھ موازنہ کیا تو انھوں نے مدارس (کالج) سے کچھ زیادہ اُمید نہیں کی اور اُن کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔ کالج کے طرزِ تعلیم نے شاہین بچوں کو قوت پرواز نہیں بلکہ غلامی اور کج ذہنی کا سبق دیا۔ ان کے اس درد کا اظہار اس شعر میں ہوتا ہے ؎

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ![۴]

وہ اس تعلیمی نظام کو امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ جس طرح مغربی تعلیم سے پیدا ہونے والے لادین اور بے مروت انسان کو انسانیت کا دشمن قرار دیتے تھے، ویسے وہ مدارس سے نکلنے والے تنگ ذہن مولویوں سے بھی نالاں تھے۔

جلوَتیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
جلوتیانِ مے کدہ کم طلب وتہی کدو۵

علامہ اقبالؒ کو اس بات پر یقین تھا کہ جدید تعلیمی نظام انسان کو اخلاقی زوال اور بے راہ روی سے نجات نہیں دے سکتی، مگر ساتھ ہی وہ مدارس سے بھی خفا تھے، جو نوجوان نسل کی سوچ پر قفل لگا کر اُن کی دنیا کو محدود کردیتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکب بازی کا٦

جدید نظام تعلیم نے نوجوانوں کو فکر معاش دے کر خالق کائنات سے بے گانہ کردیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس مغربی تصور پر تنقید کی اور اس سیکولر طرزِ زندگی کو انسانوں کے لیے زہر ہلاہل قرار دیا ہے۔ وہ اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ دینی تعلیم سے شعور بیدار ہوتا ہے اور انسانی اقدار، حق شناسی اور حق گوئی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جب کہ جدید تعلیمی نظام نے انسان کو فطری زندگی سے محروم کر کے ایک حیوانی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا ہے۔ اس لیے وہ اخلاقی زوال اور ناعاقبت اندیشی سے بچنے کے ساتھ جائز تدبیر اور صحیح اقدام کرنے پر زور دیتے ہیں۔

اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش ۸
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھُپایا جن کو
خلوَتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش ۷

علامہ اقبالؒ جس مقصد تعلیم کے لیے مسلمانوں کو اُبھارنے کی کوشش کرتے

رہے، وہ گردو پیش کے تغیر سے متاثر ہے نہ ہی باطل قوتوں کی کام یابی سے مغلوب و مرعوب۔ اسلامی تعلیم انسان کو ذِلت و پستی سے نکال کر انسانیت، تقویٰ، خداپرستی اور خداترسی کا حامل بناتی ہے۔ اقبال نے ایک کامل مسلمان ہونے کے لیے جو عناصر بیان کیے ہیں، وہ یہ ہیں ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان ۹

علامہ اقبالؒ جس تعلیمی نظام کی وکالت کرتے ہیں وہ مثالی ہے اور سماجی فلاح کی تشکیل کی ضامن ہے اور ہر طرح کی خوشی، امن و آشتی کا ضامن ہے۔ اس سے ذہنی پاکیزگی، فکری بلندی، ہوش مندی اور شعورِ حیات حاصل ہوتا ہے ؎

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ ۱۰

تعلیم کو تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں ایک اہم رول نبھانے کی ضرورت ہے، اگر یہ ایسا کرنے میں ناکام ہوئی تو کہیں نہ کہیں اس میں نقص ہے، یا اس قوم کے تعلیم یافتہ افراد اس کی صحیح ترجمانی نہیں کر پا رہے ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ معلم کا کام طالب علم کی ذہنی اُلجھنوں کو دور کرنا اور اس کو ہر وہ مواقع فراہم کرنا ہے جس سے اُس کا ارتقاء ممکن ہو سکے ؎

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی ۱۱

اسلام کی نگاہ میں علم، دماغ کو محض معلومات سے بھر دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ تصورات میں جدت لانا اور زندگی کی حقیقت پرکھنے اور انقلاب لانے کے لیے میدان عمل میں کود پڑنا، مردہ دلوں میں اسلامی بیداری کا عنصر جگانے کے لیے ہمہ وقت مصروف رہنا ہی اسلامی علم کی بنیاد ہے۔ فکری تربیت سے انسان کے اندر انقلابی روح پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حق گوئی اور سرفروشی کے جذبہ سے سرشار ہو کر ملی کاموں کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے ؎

قُدرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب
قُدرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
قُدرت فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
قُدرت فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب ۱۲؎

علامہ اقبالؒ کے فلسفہ تعلیم کا ماخذ اسلام ہے۔ وہ قرآنی آیات سے اپنے فلسفہ کو عام فہم انداز میں لوگوں تک پہنچانے کے لیے کوشش کرتے تھے، کیوں کہ تعلیم کا بنیادی فلسفہ اور مقصد انسان کی ترقی ہے۔

اقبال کے تعلیمی تصور کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں: ''اقبال نے اپنی قوم کو یقین دہانی کی کہ حقیقی ایمان دار جس کو خدا 'انسان' سے تعبیر کرتا، دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دیتا ہے اور وہ زندگی کے نشیب و فراز کو از سر نو سمت عطا کر کے قسمت بدل دیتا ہے۔'' ۱۳؎

اقبال کے تعلیمی نظریہ کا محور گرچہ اسلام ہے، مگر اس کو فعال بنانے کے لیے اگر کسی دوسرے نظام میں ان کو اچھائی ملتی تھی تو بِلا تاخیر اُس کو قبول کر کے مسلم نظام تعلیم میں وسعت پذیری کے لیے بروئے کار لاتے تھے۔ اقبال کے نظریۂ تعلیم کا مرکزی اصول توحید ہے، جو روحانیت کو عظیم المرتبت مقام عطا کرتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اصل میں انسان اپنے علم کو بڑھانا چاہتا ہے اور اللہ کی بندگی میں اپنی بھلائی اور عافیت دیکھ کر جلالِ ازلی کی غلامی میں فخر محسوس کرتا ہے ؎

باہر نہیں کچھ عقلِ خدا داد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلالِ ازلی کا ۱۴؎

اقبال کے نظریۂ تعلیم میں شخصیت کا کردار حضرت محمد ﷺ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ آپؐ کی ذات، شخصیت و کردار کے انسانی دماغ پر مثبت اور دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ ختم نبوت کو واحد ذریعۂ علاج تصور کرتے ہیں، تاکہ انسانیت کو اختلاف اور افراتفری سے محفوظ رکھا جائے اس بارے میں کہتے ہیں ''مسلم سماج کی کلیات، سالمیت اور راست بازی خالصتاً نبوت کی قطعیت سے محفوظ اور مامون ہے''۔ ۱۵؎

اقبال کا واضح پیغام ہے کہ خودی کی آگاہی اصل میں خدائی صفات کی آگاہی ہے۔اس لیے تعلیم مذہبی، اخلاقی، عقلی اور جمالیاتی ہونی چاہیے، تاکہ ایک مضبوط اور پائیدار انسان کی قدر اور پُشت پناہی ہو سکے۔اس تعلیم سے پیدا ہونے والے انسان کا نام مردمومن ہے، جوستاروں پر کمند ڈالتا ہے ؂

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دوجہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز [۱۶]

اقبال کا نظریہ خودی اُن کے فلسفہ تعلیم کا مقصدِ کلی ہے۔ اس لیے انھوں نے زندگی کی ترویج اور حفظ زندگی کا ماخذ علم کو قرار دیا ہے۔ اس سے انسانی شعور ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے خودی کو پالیتا ہے۔ اس لیے وہ اس بات کا برملا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؂

علم ازسامان حفظ زندگی است
علم از اسباب تقویم خودی است [۱۷]

علامہ اقبالؒ جس علم کی ترجمانی کرتے ہیں، اس سے ایک باشعور اور معیاری انسان پیدا ہوتا ہے۔حق گوئی اور بے باکی اس کی شخصیت کا بنیادی وصف ہوتی ہے۔ اقبال تعلیم کوخودی کی شہ رگ کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر اس کو کاٹ دیا جائے توانسان کو باشعورمخلوق ہونے کے بجائے ایک مشین بن جاتا ہے۔جس طرح تعلیم وتربیت، خودی کے لیےضروری ہے، اسی طرح خودی کے علم کا وحی سے آراستہ وہم آہنگ ہوناضروری ہے۔اس کے بغیرخودی کا تصور بدل کرخودغرضی اور ہوس پرستی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم وتربیت کے لیےعلم وحی کولازمی جزقرار دیتے ہیں۔[۱۸]

موجودہ نظامِ تعلیم ہماری مادی ضروریات کو پورا کرنے اور بڑے بڑے عہدوں تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ تو بن سکتا ہے،مگراُن کے اندرملّی سوچ اُجاگرنہیں کرسکتا۔

عصر حاضر میں نظام تعلیم کو نفس امارہ کے قلعوں سے نکال کر انسانی عقیدت اور احترام کے منہج پر استوار کرنا لازمی ہے، تاکہ عوامی اُمنگوں اور اُمیدوں اور روحانی ضرورتوں کے تحت واضح کر کے اُس کا مسودہ تیار کیا جائے ۔ ۱۹ اس نظریے کے بارے میں سید عبداللہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اقبال کا فلسفۂ تعلیم، علم، قوت حس و مدرکہ، عقل اور اِلہام جوڑتا ہے۔ اُن کے مطابق روشنی کسی ایک نظریہ اور گوشہ سے پوری حقیقت اور اس کے انکشافات کو روشن نہیں کر سکتی ہے'' ۲۰

اقبال کے تصور تعلیم میں انسان اور اس کے ماحول کا مکمل تال میل پایا جاتا ہے، تاکہ انسانیت کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کر کے اس کے مقدر کی بازیافت ہو سکے وہ یہ مانتے ہیں کہ جدید تعلیمی نظام میں اِن اقدار کی خلش پائی جاتی ہے۔اس بارے میں وہ لکھتے ہیں ۔

''زندگی کی حرکات میں احساسی ترقی ملوث ہوتی ہے جو ایک اسلوبِ ترکیبی کے ساتھ بتدریج بڑھ جاتی ہے، جو اس کے مختلف مراحل میں داخل ہو کر اس کے اسلوبِ ترکیبی کے بغیر ترقی نہیں پا سکتی ہے'' ۲۱

اصل میں اقبال جس تعلیم کے خواہاں ہیں، وہ انسانی اقدار کو اُس کے قوتِ حس سے حاصل ہوتی ہے، جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے اندر پہلے سے ودیعت کیا ہوا ہے۔اس کو نکھارنے کے لیے ایک مضبوط قوتِ حس و جسم کی ضرورت ہے، تاکہ ایک مثالی اخلاقی نمونہ پیدا ہو جائے جو دوسروں کے لیے مشعل راہ ہو۔ ۲۲ اس تصور کو مزید اُجاگر کرنے کے لیے انھوں نے ایک نظم 'شاگرد' کے نام سے لکھی ہے ۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کے موجوں میں اضطراب نہیں ۲۳

انسانی وجود کو اسلامی نظام تعلیم ہی سکون عطا کر سکتا ہے۔علم اور خاص کر سائنسی ایجادات و انکشافات کے باوجود انسان کی روحانی اور حقیقی زندگی مدہم پڑی ہوئی ہے۔ اس سے کوئی حقیقی تبدیلی رونما نہیں ہو سکی ہے۔علامہ اقبالؒ کے تصور تعلیم میں جو چیز انسانی

زندگی کی تشکیل نو میں مدد گار ثابت ہونے کے ساتھ اس کے مقصد حیات عطا کرتی ہے، وہ تعلیم کی نظریاتی تشریح ہے، کیوں کہ اس سے مقصد حیات کا شعور بیدار ہوتا ہے

زندگانی را بقا از مدعا ست

کاردانش را درا از مدعا ست ۲۴

تعلیم بنیادی طور پر منزل مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔اس انسان علم یقین سے عین الیقین کا مشاہدہ کرتا ہے اور حق الیقین تک پہنچنے کی راہ ہم وار ہو جاتی ہے۔ علم کے ذریعے انسان کائنات کے مخفی رازوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور معرفت اور محبت الٰہی کی منزل طے کر کے فلسفۂ اسلام کو نظام زندگی سے تعبیر کرتا ہے، تاکہ مذہبی اخلاقیات کے ساتھ انسان کو دوسرے شعبوں میں راہ نمائی حاصل ہو سکے

زندگی سرمایہ دار آرزو ست

عقل از زائیدگان بطن اوست ۲۵

اقبال اُس تعلیم کو شیطنیت سے تعبیر کرتے ہیں جو مذہب سے ہم آہنگ نہ ہو۔ انھوں نے الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے جلسہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''آج اگر آپ اپنی تمام قوت کی طرف توجہ مبذول کریں گے تو آپ اپنے بکھری ہوئی قوت کو منجمد کر کے ایک نئی روح پیدا کر سکتے ہیں۔اس طرح آپ اپنی تباہی سے بچ سکتے ہیں اور اُن قوتوں کو ایک سمت عطا کر کے ایک نئی دنیا کھڑی کر سکتے ہیں۔'' ۲۶

اقبال انسانی زندگی میں دوام اور شجاعت دیکھنا چاہتے ہیں، وہ راہبوں والی غیر حقیقی صوفیانہ زندگی کے خلاف تھے۔اس کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''بد قسمتی سے مذہب کو صوفیت سے تعبیر کیا گیا، جو کہ ترک دنیا اور حقیقت سے دور زندگی گزرانے کا طرز عمل ہے۔ یہ طرز تو مشاہدات اور تجربات کی زندگی کو پس پشت ڈالنے والا ہے، جب کہ الٰہی مذہب جو زندگی کے اعلیٰ مقام کے لیے ضروری ہے، مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے۔جس کی بنیاد سائنس سے بہت پہلے مذہب اسلام نے کھڑی کی ہے اور انسانی شعور کو اُجاگر کرتی ہے۔'' ۲۷

اقبال تعلیم کے شعبے میں مذہب (جو انسان کو باوقار اور خود آگاہ و محبوب بناتا ہے) کو بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان کے نزدیک جو محض روایتی اور مراسمی حد تک محدود نہیں ہے۔فرماتے ہیں ؂

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و منا جات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مُلا و جمادات و نباتات ۲۸

اقبال کا فلسفیانہ اور حکیمانہ تصورِ تعلیم، انسان کو حرکت اور ترقیاتی سوچ عطا کر کے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مضبوطی کے ساتھ سمت کو درستی سے آراستہ کرتا ہے۔۲۹ وہ اس تصور کے حامی ہیں کہ انسانی فطرت علم کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ غور وفکر کر کے حق تک رسائی حاصل کرے۔اُن کا نظریہ ہے کہ جو تعلیم بنیادی اقدار کو رد کرتی ہے، وہ سماج کے لیے بے سود اور مہلک ہے۔انسان کا اولین فرض ہے کہ وہ اجتماعیت کے لیے کچھ نہ کچھ کردار ادا کرے۔اس لیے ہر انسان کو سماج کے بقائے باہمی کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہیے۔سماجی ترقی کے لیے اسے بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔زندگی میں دوسروں پر انحصار سے اپنے اندر بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور انسان اپنا وقار اور قیمت کھو دیتا ہے ؂

یکے خود را بسوز خویشتن سوز
طواف آتش بے گانہ تا کے
از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخل سینائے خودی ۳۰

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اقبال نے مغربی طرز تحقیق اور سائنسی ایجادات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا، کیوں کہ مغربی فکرِ تحقیق نے اُن کی اقوام کو ترقی یافتہ بنا کر پورے نوع انسانی پر دست رس حاصل کرنے میں مدد دی ہے ؂

قوت مغرب نہ از چنگ ورباب
نہ زرقص دخترانِ بے حجاب
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است ۳۱

عصر حاضر میں جس انداز سے نظام تعلیم رائج کیا گیا ہے،اس سے انسان مکمل طور پر انسان اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ اگراس کو اپنی شناخت برقرار رکھنی ہے تو پہلے اپنی تہذبی ساخت کو بچانا ہوگا ۔

علم غیر آموختی اندوختی
روئے خویش از غازہ اش افروختی
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت
قوم قوم آمد کہ جز با خود نساخت ۳۲

تعلیم کا حقیقی مقصد انسان کو خودغرضی اور مفاد پرستی سے اُٹھا کر انسان دوستی سے سرشار کرنا ہے،تا کہ سماج کا حصّہ بنے ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں ۳۳

تمام مخلوقات میں انسان کو افضل ترین مقام عطا کیا گیا تھا۔اس کو برقرار رکھنے کے لیے اعلیٰ تعلیمی معیار کی ضرورت ہے، جو انسانی قدرو قیمت اور دوسری مخلوقات پر شفقت سے معمور ہو ۔

وانمودن خویش را خوی خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروی خودی است ۳۴

علامہ اقبالؒ کا نظریۂ تعلیم اصلاح اورارتقائی سوچ پیدا کرنے کی صلاحیت سے بھر پور ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ ایسی سوچ تب ہی ممکن ہے جب نظام تعلیم کو لوگوں کی ضروریات کے مطابق استوار کیا جائے، تا کہ بچوں کی پرورش غلامانہ ذہنیت سے آزاد

ہو۔اس کے برعکس مغربی تعلیم کا مقصد انسانی جسم کو تمام لذات میں قید کر کے رقص بدن میں غافل رکھنا ہے۔۳۵

اقبال کے مطابق تعلیم روحانی اور مادی ضروریات کی مرکب ہے ۔روحانیت انسان کو عدل وانصاف ، بھائی چارہ اور مساوات کا درس دیتی ہے، جب کہ مادیت صرف اس کے جسم کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔انھوں نے روحانی اور مادی مرکب کو قرآن سے اخذ کیا ہے۔اُن کے مطابق 'روحانیت' قرآنی تعلیمات کے مطابق قطعی حقیقت ہے، کیوں کہ روح اپنے مواقع قدرتی ماحول سے اخذ کرتی ہے، جب کہ مادہ دنیاوی ماحول سے وابستہ ہے ۔اس دنیا میں کوئی چیز غیر مذہب یا الحادی نہیں ہے نہ دنیا بہ نفس نفیس الحاد کی پیداوار ہے۔ مادے کی یہ بے پایاں فراوانی روح کی اہمیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ کائنات ایک مقدس جگہ ہے، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ 'پوری روئے زمین مسجد ہے'۔ یہ روحانیت اور مادی زندگی کا مرکب اپنے انجام خیر تک درکار ہے۔اس کے برعکس سیکولر سوچ نے دین اور دنیا میں تفریق کر کے ایک غیر فطری نظام زندگی کی بنیاد ڈالی ہے''۔۳۶

وہ مزید لکھتے ہیں:''قرآن سائنسی انداز فکر کو روحانی زندگی کے لیے ناگزیر تصور کرتا ہے ،جب کہ مساوی طرز زندگی کے لیے سائنسی زندگی کو ناگزیر تصور کر کے انسانی تجربات کو مساوی اہمیت دیتا ہے۔''۳۷

عصر حاضر کے تعلیمی نظام نے انسان کی اندرونی صلاحیت کو تکمیل تک پہنچانے اور انسانی راز کو منکشف کرنے کے لیے دوسروں کو داؤ پر لگا دیا اور علم کو اخلاقیات سے الگ کر کے ایک معیاری شخصیت بننے سے عاری کر دیا،جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سماج میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو گیا جب کہ معیاری انسان بننے کے لیے روح و بدن کا تال میل لازمی ہے۔

دور جدید میں تعلیم کو نان ونفقہ کا ذریعہ قرار دیا گیا، جب کہ تعلیم کا بنیادی مقصد ایک انسان دوست اور با اخلاق انسان تیار کرنا ہے ،جو دوسروں کو دکھ درد سے نجات دِلا سکے ۔

علم را بر تن زنی ماری بود!
علم را بر دل زنی یاری بود! ۳۸

مسلم دنیا میں بھی علم کی جو تقسیم کی گئی وہ الٰہی نظام کے خلاف ہے۔ مدارس اسلامیہ میں سائنسی علوم کو شجر ممنوعہ قرار دیا گیا اور عبادت کی کچھ تعلیمات کو پورا دین قرار دیا گیا ہے۔جس طرح مغربی سیکولر پسندوں نے مذہب کو ریاست سے خارج کر کے اسے ایک انفرادی ضرورت قرار دیا ہے، اسی طرح اسلامی جامعات اور دینی مدارس میں سائنسی دریافت کو نظام قدرت میں مداخلت قرار دیا گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ وسطی دور میں مسلمانوں نے جو سائنسی اصول وضوابط قائم کیے تھے، اُن کو بروئے کار لا کر سائنس کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوشش جاتی۔

ہمہ جہت منظّم نظام تعلیم کے لیے تربیت اور انضباط بہت ہی اہم ہے۔ برصغیر کے مروجہ نظامِ تعلیم میں ایسی نظری اور فکری سطحیت ہے، جس سے ایک ترقی یافتہ اور بااخلاق انسان کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔اقبال نے اس کو وسیع تناظر میں لیا ہے، جس کو وہ مسلسل انضباط قرار دیتے ہیں، جس سے انسانی سیرت اُبھر آئے اور قوم صحیح سمت اور صحیح رُخ اختیار کرے۔ان کے نظریۂ تعلیم میں وحدانیت کے عنصر کے ساتھ عمل صالح کا اہم کردار ہے۔وہ اس بات سے متفق تھے کہ ایمان، عمل صالح اور عقل کی بلند ترین ترقی کا انضمام انسان کو کارخانۂ قدرت کے صحیح استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔عقل کا کامل ارتقا ہی انسان کو محترم بنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مختلف صلاحیتوں سے آراستہ کیا ہے۔اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرے اور ایک پائیدار قوم کو وجود میں لانے میں اپنا کردار ادا کرے۔

باہر نہیں کچھ عقلِ خدا داد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلالِ ازلی کا ۳۹

تعلیم انسان کے اندر جستجو پیدا کرتی ہے۔اس کے اندر دانش مندی اور بصیرت پیدا کرتی ہے۔علم انسانی عقل کو صاف وشفاف بنا دیتا ہے۔فقر اور عقل کا سنگم ہو تو انسانی قلب ونظر کی پاکیزگی عطا ہوتی ہے۔

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفّتِ قلب و نگاہ ۴۰؎

اقبال کے مطابق علم انسان کو خدا پرست، غیرت مند اور انسانیت کے لیے نمونہ کے طور پر اُبھارتا ہے۔ تعلیم انسانیت کی بقا کے لیے انسانی وجود کو معرفت اِلٰہی سے وابستہ کر کے شعوری بیداری عطا کرتی ہے۔ اس لیے تعلیم کے دونوں شعبے سائنس اور فن کا انسانیت کی خدمت پر معمور ہونا لازمی ہے۔ سیکولر نظام تعلیم نے طلبہ کو حق سے ناآشنا کر کے نفس کی خدمت کے لیے اُبھارا اور اس کو روٹی، کپڑا اور مکان کی فکر دے کر سچائی سے محروم کر دیا ہے۔

اقبال ماضی اور حال کے انضمام کے خواہاں تھے۔ اس کے لیے وہ حقیقت پسندانہ اور انسانی ضروریات کو پورا کرنے والا تعلیمی نصاب تیار کرنے پر زور دیتے تھے، جو سماج کو اصول وضوابط کے ساتھ قدر و قیمت سے ہم آہنگ کر سکے۔ اس لیے تاریخ کا مطالعہ اقبال کے تعلیمی نصاب میں سب سے اہم مقام و رتبہ رکھتا ہے۔ ۴۱؎

اقبال کا نظریۂ علم، عصری اور دینی علوم کا سنگم ہے۔ وہ مروجہ تعلیم اور مدرسی تعلیم کا اتصال کر کے دونوں اقسام کے اداروں کے نصاب کے حق میں تھے، تا کہ تعلیم کا بنیادی مقصد حاصل ہو، یعنی ایک مہذب انسان پیدا ہو سکے۔ اس لیے انھوں نے اپنے وقت کے پڑھے لکھے لوگوں کی مدد سے اردو کا نصاب (خاص کر ساتویں جماعت کا) تیار کر کے اپنے تعلیمی منصوبے کا خاکہ پیش کیا ہے۔ زمانے میں نئی تبدیلیاں، چاہے وہ تجرباتی ہو یا لغوی، طلبہ کی آگاہی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے ساتھ وہ طلبہ کو نکھارنے کے لیے اُن کے اندر مطالعہ کا ذوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسی کتابیں مرتب ہونی چاہیے جو دنیاوی اور روحانی علم پر مبنی ہو۔ اس بارے میں وہ کہتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوزِ حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا ۴۲؎

اقبال جس نصاب کی وکالت کرتے ہیں وہ عظیم اخلاقی اقدار کی غمازی کرتا ہے، تاکہ ہر طالب علم باوقار، باصلاحیت اور اپنی ثقافت کا نمونہ ہو اُن کے اندر جذبۂ تحقیق اتنا بلند ہو کہ وہ اپنے ماحول کو اچھی طرح جانچ سکے اور ماحول کی تغیر و تبدیلی پر اُس کو دست رس حاصل ہو۔ انسانی جانیں بہت کم تلف ہوں اور سامراجی قوتیں اُن کے وسائل پر قابض نہ ہوسکیں۔[۴۳]

علامہ اقبال نے مغربی طرزِ تعلیم کو مہلک کیوں قرار دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس میں اخلاقی روح نہیں ہے۔ مغربی تعلیم انسان کو ٹیکنو کریٹ بنا سکتی ہے، مگر انسانیت کو حقیقی روح سے غافل بھی کر دیتی ہے۔ علمی تجربات کے باوجود مغرب فکری اعتبار سے مادہ پرستی سے اوپر نہیں اٹھ سکا اور سلوک و عمل میں حیوانیت سے بلند نہیں ہو سکا۔ علامہ اقبالؒ ایسے علم سے پناہ مانگتے تھے۔ فرد کی ذات اور سماج کے لیے موثر ثابت نہ ہوسکے۔ کیونکہ ایسا علم خود صاحب علم کے لیے بھی اور آس پاس کے لوگوں اور ماحول کے لیے بھی وبال بن جاتا ہے۔ علماء اور فلاسفہ جن کا باطن ان کے ظاہر کی تردید کرتا ہے، عام لوگوں کے لیے فتنہ کا سبب بن جاتے ہیں، کیوں کہ لوگ قول سے زیادہ عمل سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ’’ایک آدمی کی عملی حالت ایک ہزار لوگوں کو متاثر کرسکتی ہے۔‘‘ علامہ اقبالؒ نے مغربی اہلِ علم اور فلاسفہ کی حالت دیکھ کر اپنی آرزو کا اظہار کیا اور یوں نوجوانوں کے حق میں دعا گو ہوئے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر اِن شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خُدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے[۴۴]

علامہ اقبالؒ اور سرسید کے تعلیمی مشن میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو خود تعلیمی ماخذ پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، جب کہ سرسید اُن کو انگریزوں کے سائنسی افکار سے فائدہ اُٹھانے کی ترغیب دیتے تھے۔ دونوں کے مشن میں مسلمانوں کی بازیافت عیاں ہے۔ دونوں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنا مستقبل

سنواریں۔ سرسید کے بعد اگر مسلمانانِ ہند کو کسی نے علم کی خاطر جدوجہد کرنے پر ابھارا ہے تو وہ علامہ اقبال کی عظیم شخصیت ہے۔ سرسید کے افکار کی عکاسی کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۰۳ء میں ایک نظم اُن کے اعزاز میں لکھی تھی، جس کا عنوان 'سرسید کی لوحِ تربیت' ہے۔ اس نظم میں وہ فکرِ سرسید کی ہم نوائی میں دلی تسکین پاتے ہیں ؎

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دین
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں [۴۵]

اسلام کا نظام تعلیم حکمت کا علم بردار اور حق تک رسائی کا ایک واحد ذریعہ ہے اس لیے علامہ اقبال مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات سے رہ نمائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو خبردار کرتے ہیں کہ نفسانی تباہی سے بچنے کے لیے قرآنی آیات پر غور کرنا لازمی ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ قرآنی آیت کے الفاظ اَحَلُّو قَوْمَهُمْ دَارُالْبَوَار استعمال کر کے اُمت محمدﷺ کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

جنّتی جُستند درِ بِئسَ القَرار
تَا اَحَلُّو قَوْمُھُم دَارُالبَوَار
مردمی اندر جہان افسانہ شُد
آدمی از آدمی بیگانہ شُد [۴۶]

اِن اشعار میں جس تعلیمی ڈھانچے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، وہ تعصب اور قومیت سے آزاد، انسان پرورده اور آپسی بھائی چارہ کا علم بردار ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو جدوجہد کرنی چاہیے اور ہمہ تن کوشاں رہنا چاہیے۔ علم کی بنیاد پر انسان دنیا و آخرت میں عزت پاتا ہے اور یہ بات فلسفیانہ طرز عمل سے بھی واضح ہے، لیکن جس علم کا مقصد صرف دو وقت کی روٹی اور عیش پرستی ہے اس کو علامہ اقبالؒ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو [۴۷]

اقبال کا نظریہ تعلیم تمام دنیا کے لیے مشعل راہ ہے۔اس میں خاص کر مسلم دنیا کی عزت کا عنصر پنہاں ہے۔ وہ مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گام زن کرنے کے لیے بہت ہی اہم کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اسی نظام تعلیم کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا تو انہوں نے علم کے ہر میدان پر دست رس حاصل کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم ’فردوس میں ایک مکالمہ‘ میں جدید تعلیم میں مذہب کی ضرورت و افادیت کو اہمیت دی ہے۔اسی طرح اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو سائنسی علوم حاصل کرنے چاہیں ؎

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملتِ سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز[۴۸]

اقبال کے تصور تعلیم سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ایسا نظام تعلیم درکار ہے جس میں مشرق و مغرب کی تمام خوبیاں مجتمع ہوں، تاکہ ایک مکمل اور مضبوط روح پرورش پا سکے۔عصر حاضر کے مسلمانوں کو اقبال جیسے مفکروں کی ضرورت ہے، جو اُن کے اندرون کو اُجاگر کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں اور ایک مضبوط

انسان دوست سماج قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ اقبال کا پیغام جغرافیائی قیود سے بالاتر ملّت اسلامیہ اور انسانیت دنیا کے لیے ہے۔ وہ ملت کی کام رانی کو بنی نوع انسان کی کام یابی سے تعبیر کرتے تھے۔

حواشی و مراجع

۱۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، ص ۶۴۸

۲۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، دین و تعلیم، ص ۵۹۹

۳۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، نصیحت، ص ۶۶۶ ۴۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص ۳۸۲

۵۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ذوق و شوق، ص ۴۳۸

۶۔ کلیات اقبال، بال جبریل، (کابل میں لکھے گئے) ص ۳۷۲

۷۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، مدرسہ ص ۵۹۶ ۸۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، مدرسہ، ص ۵۹۷

۹۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، مرد مسلمان، ص ۵۷۳

۱۰۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص ۴۰۵ ۱۱۔ ایضاً، ص ۴۹۵۔۴۹۴ ۱۲۔ ایضاً، مسولینی، ص ۴۸۰

13. Taneja and Taneja, Seven Indian Educationists, P. 150-151

۱۴۔ کلیات اقبال، ص ۴۲۲

15. Sheerwani, Latif Ahmad, Speaches and Staements of Iqbal,Iqbal Academy,Lahore; 3rd. edition,1977, p.94

۱۶۔ علامہ اقبال، بال جبریل، ص ۱۳۲ ۱۷۔ علامہ اقبال، اسرارِ خودی، ص ۱۱۷

18. Aal Ahmad Suroor, Modernity and Iqbal, Iqbal Institute, University of Kashmir,Srinagar, 1985 p.65

19. Sheerwani, Latif Ahmad. Opcit. p.96

۲۰۔ سید عبداللہ، مقامات اقبال، ص ۲۳۸

21. Allama Iqbal, Op.Cit, p.52

22. Wahid, S. A. Thoughts and Reflections of Iqbal, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore 1964, p.14

۲۳۔ کلیات اقبال، ص ۵۵

۲۴۔ اقبال، در بیان اینکہ حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است، اسرار خودی، ص ۱۵

۲۵۔ کلیات اقبال (فارسی) اسرارِ خودی، ص ۱۷

26. Iqbal Singh Sevea (29 June 2012). The Political Philosophy of Muhammad Iqbal: Islam and Nationalism in Late Colonial India. Cambridge University Press. p. 14
27. Allam Iqbal, OP.Cit, p.181

۲۸۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص۱۹۶

29. Sheerwani. L.A. Op.Cit, p.96

۳۰۔ اقبال، پیام مشرق، ص۱۷ ۳۱۔اقبال، جاوید نامہ، ص۲۰۸

۳۲۔ اقبال، درتفسیر سورہ اخلاص: اللہ الصمد، رموز بے خودی، ص۱۸۷۔۱۸۶

۳۳۔ کلیات اقبال، بانگ درا، ص۲۱۷

۳۴۔ کلیات اقبال (فارسی) دربیان اینکہ اصل نظام عالم از خودی است وتسلسل حیات تعینات وجود براستحکام خودی انحصار دارد، اسرار خودی، ص۲۴ ۳۵۔علامہ اقبال، جاوید نامہ، ص۲۴۵

36. Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam, Op.Cit. p.55
37. Ibid, 50

۳۸۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص۱۸۰

۳۹۔ کلیات اقبال، ص۴۲۲ ۴۰۔کلیات اقبال، بال جبریل، ص۱۱۰

41. Sayidien K.G. OP.Cit, p.169

۴۲۔کلیات اقبال، ص۴۸۵

'43. Iqbal review, july, 1961, pp.94-98

۴۴۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص۳۷۸

۴۵۔ کلیات اقبال، بانگ درا، سید کی لوح تربیت، ص۸۴

۴۶۔ کلیات اقبال (فارسی)، فرہنگ و ترجمہ حمید اللہ شاہ ہاشمی، رموز بے خودی، درمعنی اینکہ وطن اساس ملت است، مکتبہ دینیال، لاہور، ص۱۹۲

۴۷۔ کلیات اقبال (اردو) ضرب کلیم، ص۶۷۸

۴۸۔ کلیات اقبال (اردو)، بانگ درا: فردوس میں ایک مکالمہ، ص۲۷۵

تعارف وتبصرہ

علوم القرآن۔ایک جائزہ ڈاکٹر ابوسعد اعظمی

ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، سنہ اشاعت: ۲۰۲۱ء، صفحات: ۱۵۲، قیمت: ۳۰۰ روپے

قرآن مجید علوم و معارف کا سر چشمہ ہے۔اکتسابِ علم اور زندگی کا الٰہی نقشہ معلوم کرنے کے لیے قرآن مجید کا سمجھنا ضروری ہے اور فہمِ قرآن کے لیے اس کے اصول ومبادی کا علم لازمی ہے۔قرآن کا نزول کیسے ہوا؟ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتب میں کتنی مماثلت ہے؟ اور اس کے امتیازات ہیں؟ تدوین قرآن کی تاریخ کیا ہے؟ مصادرِ تفسیر اور فہم قرآن کے لیے معاون امور کیا ہیں؟ یہ موضوعات 'علوم القرآن' میں زیر بحث آتے ہیں۔

علوم القرآن پر عربی اور اردو میں خاصا کام ہوا ہے۔علامہ زرکشیؒ کی 'البرہان فی علوم القرآن'، علامہ سیوطیؒ کی 'الاتقان فی علوم القرآن'، ڈاکٹر صبحی صالح کی 'علوم القرآن' اور اردو میں مفتی محمد تقی عثمانی کی 'علوم القرآن' مقبول اور مشہور کتابیں ہیں۔زیر نظر کتاب کا بھی یہی موضوع ہے۔یہ اصلاً پروفیسر خلیق احمد نظامی قرآنک سینٹر (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کے درسی نصاب کے پروجیکٹ کا حصہ ہے۔

مصنف کتاب ڈاکٹر ابوسعد اعظمی نے مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ سے فراغت کے بعد شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔اس وقت ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ میں بہ حیثیت رفیق وابستہ ہیں۔عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کے متعدد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول کا عنوان ہے: 'وحی۔مفہوم، حقیقت اور مستشرقین'۔اس باب میں وحی کے لغوی اور اصطلاحی معانی، وحی کی اقسام اور صورتیں بیان کی گئی ہیں۔قرآن مجید سے متعلق مستشرقین کے نظریے اور رویّے کا ذکر کیا گیا ہے کہ مشرکین مکہ کی طرح وہ قرآن کو انسانی کلام ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ انسانی کلام ثابت کر کے اس میں نقائص نکالنا اور لوگوں کے دلوں سے اس کی

عقیدت واحترام کو ختم کرنا آسان ہوگا۔قرآن کے وجوہِ اعجاز میں نبی کریمؐ کی امّیت ، واقعاتِ غیب ، فصاحت و بلاغت ، قرآنی احکام کے ذکر کے ساتھ مستشرقین کے اس اعتراض کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ قرآن سابقہ کتبِ مقدّسہ سے ماخوذ ہے۔اور کہا گیا ہے کہ قرآن اور کتبِ سابقہ میں مماثلت کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اسی ہدایت کا تسلسل ہے جو وحی ربانی کی صورت میں نازل ہوئی تھی ۔اس کے بعد قرآن مجید کا تعارف ، امتیازی خصوصیات اور دیگر آسمانی صحائف اور کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔قرآن،حدیث اور حدیثِ قدسی کی تعریفات بیان کرتے ہوئے ان کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے۔

باب دوم، جو کتاب کا سب سے طویل باب ہے، 'حفاظتِ قرآن اور اس کے مختلف مراحل کا تذکرہ' کے عنوان سے ہے۔اس میں مصنف نے نزولِ قرآن ،آغاز ، کیفیت ، ترتیب کا ذکر نے کے ساتھ تدریجی نزول کی حکمتیں بیان کی ہیں ۔ حفاظتِ قرآن اور تدوینِ قرآن کی بحث کا جامع خلاصہ پیش کیا ہے۔تدوینِ قرآن کے سلسلے میں مستشرقین کے اعتراضات کا جواب علماء سلف وخلف کی آراء کی روشنی میں دیا ہے ۔ تدوین قرآن سے متعلق روایات کا اضطراب، صحیح احادیث اور علمائے اسلام کا نقطۂ نظر نہایت سلیقے اور عام فہم انداز میں نقل کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے دونوں نقطہ ہائے نظر کہ تدوینِ قرآن عہد نبویؐ میں ہی ہوگئی تھی ،یا یہ کام عہد صدیقی میں ہوا تھا، بیان کرنے کے بعد اپنی رائے کا واضح لفظوں میں اظہار نہیں کیا ہے، البتہ وہ اول الذکر رائے کے حق میں مولانا فراہیؒ کے پیش کردہ دلائل سے مطمئن نظر آتے ہیں ۔اس کے بعد مکی ومدنی سورتوں کی خصوصیات وامتیازات کا ذکر ہے ۔

باب سوم کا عنوان ہے: 'علم تفسیر۔آغاز وارتقاء اور اہم مفسرین کے حالات'۔ اس میں علم تفسیر کے آغاز وارتقاء ،ضرورت اور حکم پر بحث کی گئی ہے ۔اسی ضمن میں تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے کی تعریفات اور حدود بیان کیے گئے ہیں۔اس کے بعد مصادر تفسیر: قرآن، حدیث، آثار صحابہ وتابعین، کتبِ سماوی اور لغت کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے ۔ اس بحث میں تفسیر قرآن کے ارتقائی مراحل کا بھی ذکر آگیا ہے ۔اخیر میں چار بنیادی تفسیروں: جامع البیان فی تفسیر القرآن (طبریؒ)،تفسیر القرآن العظیم (ابن کثیرؒ)، مفاتیح الغیب (رازیؒ)اور الکشاف عن حقائق التنزیل (زمخشریؒ) کا تعارف پیش

کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کے مختصر حالات، تفسیروں کی خصوصیات وامتیازات کے ذکر کے ساتھ ان کے بعض کم زور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور عمدہ پیش کش ہے۔طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زبان عام فہم استعمال کی گئی ہے۔ تدوین قرآن، ناسخ ومنسوخ کی مشکل بحث کو نہایت سلیقے سے سہل زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر باب کے اخیر میں حوالہ جات کا اہتمام کیا گیا ہے۔اہم کتابوں کی جانب بھی رہ نمائی کی گئی ہے۔ کتابیات میں عربی، اردو اور انگریزی کی فہرست شامل ہے۔ مصنفِ کتاب اس علمی کام پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے، یہ کتاب طلبہ کے ساتھ عوام کے لیے بھی مفید ہوگی۔

(محمد انس فلاحی مدنی)

رجوع، فہم اور تدبر قرآن۔ چند معروضات — پروفیسر سید مسعود احمد

ناشر: ادارہ دعوت القرآن، کلن کی لاٹ، امین آباد، لکھنؤ (یو۔پی)، سن اشاعت: ۲۰۲۰ء، صفحات: ۲۰۰

قرآن مجید ساری انسانیت کے لیے تا قیامت کتابِ ہدایت ہے۔ دنیا میں آباد کسی بھی خطے کے کسی فرد بشر کی فلاح ونجات قرآن ہی سے وابستہ ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت اس نے ہمہ گیر مثالی انقلاب برپا کیا تو آج اس راہ میں کیا رکاوٹ ہے؟ آج بھی مطلوبہ تدبر کے ذریعے اہل ایمان وہ صلاحیت حاصل کر سکتے ہیں جس سے ان کی چشمِ بصیرت کھلے اور ان کے سامنے حتمی حقائق منکشف ہو جائیں، تاکہ دنیا پر قرآنی فیوض وبرکات کی موسلا دھار بارش ہونے لگے۔ بس شرط خلوصِ نیت کے ساتھ عزم بالجزم اور مطلوبہ لوازم پر عمل کی ہے۔ انھی احساسات کے تحت فاضل مصنف نے زیرِ تبصرہ کتاب تصنیف کی ہے۔

علی گڑھ کے دینی وعلمی حلقے میں پروفیسر سید مسعود احمد کی شخصیت تحریک رجوع الیٰ القرآن، درسِ قرآن، فہم قرآن اور مطالعۂ قرآن کے حوالے سے مشہور ومعروف ہے۔ موصوف اصلاً سائنس کے اسکالر ہیں، مگر قرآن مجید کے فہم ومطالعہ سے آپ کی گہری دل چسپی نصف صدی پر محیط ہے۔ قرآنیات سے متعلق آپ کی متعدد تصنیفات اردو اور انگریزی میں اہل علم کو دعوتِ فکر وعمل دیتی ہیں۔ ان میں 'ہم قرآن سے کیسے

استفادہ کریں؟'، 'قرآن مجید عظیم الشان لاثانی کتاب'، 'عظمت و اعجازِ قرآن کے عجیب و غریب پہلو' اور 'اصلاح و فساد اور عروج و زوال کا قرآنی تصور' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے 'رجوع الیٰ القرآن کی مختصر تاریخ مع لوازم درس و خلاصۂ قرآن'۔ اس میں برّ صغیر ہند میں رجوع الیٰ القرآن کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ پھر اس کی بعض عملی اجتماعی شکلوں، مثلاً درسِ قرآن، اجتماعی مطالعۂ قرآن اور خلاصۂ قرآن کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرا باب 'قرآن کریم سے مطلوبہ استفادہ کے شرائط و آداب' کے عنوان سے ہے۔ یہ پہلے باب کا تتمّہ و تکملہ ہی نہیں، بلکہ اس کے اجمال کی تفصیل بھی ہے۔ اس میں مطالعۂ قرآن کے آداب و شرائط کو ایک نئے زاویہ سے پیش کیا گیا ہے۔ نیز تدبّرِ قرآن اور قرآن فہمی کے متعدد ذرائع و لوازم سے متعارف کرایا گیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ہے: 'قصۂ آدم و ابلیس۔ تدبر اور حکمتیں'۔ اس کے تحت بیسویں صدی کی چند مشہور اردو تفاسیر کی روشنی میں قصۂ آدم و ابلیس کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھا باب 'قصۂ موسیٰ و خضر۔ تدبر اور حکمتیں' کے عنوان سے ہے۔ اس میں بھی چند اردو تفاسیر کی روشنی میں موضوع کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب کا عنوان ہے: 'تفاسیر قرآن میں آفاقی جہات کی شمولیت۔ عصر حاضر کا تقاضا'۔ اس میں اس جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ موجودہ دور میں قرآن مجید کے آفاقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی تفسیر کی اشدّ ضرورت ہے۔ آخر میں بعض شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے چند معروضات پیش کی گئی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب رجوع الیٰ القرآن کی پُر زور دعوت دیتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس ضمن میں امت کی غفلت اور بے پروائی کا شکوہ کرتے ہوئے رجوع الیٰ القرآن کے نام پر منحرف طریقوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں: ''رجوع الیٰ القرآن کی تحریک کے ضمن میں آج کی سب سے بڑی ضرورت مختلف امور میں متوازن رویّوں کو اجاگر کرنے کی ہے، جس کے لیے ہمیں ایک طرف اسلاف کے ذخیرۂ علم خصوصاً ذخیرۂ تفسیر، علوم القرآن سے متعلق قدیم و جدید علمی سرمایہ، صحیح حدیث کی تعیین اور ان کا قرآن کریم سے انطباق نیز تفسیری احادیث کے بارے میں متوازن رویہ پیش کرنا ہے تو دوسری طرف جدید و قدیم دونوں علوم کی اہمیت بتاتے ہوئے قرآن فہمی کے تعلق سے تعقّل بنام سائنس اور ایمان بنام اندھی عقیدت، دونوں غیر متوازن رویوں کی تصحیح کرنا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ یہ کتاب عصرِ حاضر میں رجوع الیٰ القرآن کی توضیح وتشریح اور مسلمانوں کو قرآن کے متعلق پیدا شدہ دوری ومہجوری کو ختم کرنے کے ضمن میں ایک اہم کوشش ہے۔ تمام علمی و دینی حلقوں کو اسے ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے۔

(محمد جرجیس کریمی)

اشاریہ ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ (۱۹۸۵ء تا ۲۰۲۰ء)

مرتب وناشر: ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

ملنے کا پتہ: ادارۂ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲، اشاعت: ۲۰۲۱ء، صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۱۰۰/روپے

رسائل ومجلّات کی دنیا میں 'ششماہی علوم القرآن علی گڑھ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ قرآنیات پر منفرد مجلّہ ہے، ۱۹۸۵ء سے اس کی اشاعت شروع ہوئی اور اب تک پینتیس (۳۵) جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ جن میں تین خصوصی شمارے بھی ہیں۔ ایک سوساٹھ (۱۶۰) صفحات پر مشتمل یہ مجلّہ ابنائے قدیم مدرسۃ الاصلاح، شاخ علی گڑھ کی کوششوں کا ثمرہ ہے، جو ادارہ علوم القرآن کی نگرانی میں اشاعت پذیر ہے۔ اس میں اداریے سے لے کر خبر نامے تک ہر کالم قرآن اور قرآنی علوم وافکار کے لیے مختص ہے۔ مقالات کا انگریزی خلاصہ مجلّے کے آخر میں دیا جاتا ہے۔ ۲۰۰۵ میں اٹھارہ (۱۸) جلدوں پر مشتمل شماروں کا اشاریہ شائع کیا گیا تھا۔ زیرنظر کتاب میں اب تک کے تمام شماروں کے مندرجات کا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے اور اس میں پہلے ایڈیشن کے مشتملات کو بھی ضم کردیا جاگیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اشاریہ ۱۹۸۵ء تا ۲۰۲۰ء کے شماروں کا احاطہ کرتا ہے۔

اشاریے میں مقالات کے علاوہ مجلّے کے مستقل کالموں (اداریہ، تعارف و تبصرہ، کتاب نما اور خبر نامہ) کے مشتملات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ لیکن 'کتاب نما' کے تحت ہر شمارے میں اردو، عربی اور انگریزی رسائل میں قرآنیات پر شائع ہونے والے نئے مضامین کی فہرست اس اشاریے میں شامل نہیں ہے۔ اشاریہ کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور 'خبر نامہ' کے تحت قرآنیات سے متعلق شائع ہونے والی خبروں کو بھی موضوع کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر موضوع کے تحت مندرجات کی ترتیب

میں حروف تہجی کی رعایت کی گئی ہے۔ البتہ' اداریوں' اور' خبر نامہ' کالم کے تحت سیمیناروں، کانفرنسوں، مذاکرات اور ادارہ علوم القرآن میں منعقد ہونے والے خطبات و دیگر علمی پروگراموں اور مسابقات سے متعلق خبروں کے اندراج میں زمانی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ بعض اداریوں میں علمائے قرآن پر تحریر کی گئی وفیات یا سیمینار پر پیش کیے گئے تأثرات کو وفیات/سیمینار کی سرخی کے تحت بھی درج کیا گیا ہے، تاکہ استفادے میں آسانی ہو۔ مجلّے کے تین خصوصی شماروں (مولانا امین احسن اصلاحی نمبر، قرآنی علوم بیسویں صدی میں اور عصرِ حاضر کے مسائل اور قرآنی تعلیمات) کا اشاریہ عام شماروں سے الگ آخر میں مرتب کیا گیا ہے۔ اول الذکر خصوصی اشاعت کی ترتیب موضوعی ہے، جب کہ باقی دو کی ترتیب متعلقہ شمارے کی ترتیب کے مطابق ہے۔

اشاریہ کا یہ ایڈیشن سابق ایڈیشن سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ پہلا ایڈیشن ۲۲/حصوں پر مشتمل تھا، جب کہ پیشِ نظر ایڈیشن میں اکتیس (۳۱) حصے ہیں۔ اس کے مشمولات کی موضوعاتی تقسیم میں بھی ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔ مزید اس کے ذیلی عناوین میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس میں مضمون نگاران/مرتبین/مترجمین اور مبصرین کا اشاریہ بھی شاملِ ہے۔ ان تبدیلیوں اور اضافوں کے ذریعے قارئین کی نفع رسانی پیش نظر رہی ہے۔ آج کی تیز رفتار علمی ترقی کے دور میں رسائل و مجلّات کے اشاریوں کی ترتیب و اشاعت کی اہمیت بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ کم سے کم وقت میں محقق کو مقصود تک رسائی دلاتے ہیں، نیز اس سے خود متعلق مجلّہ کی مجموعی کارکردگی کا جائزہ لینے کا موقع فراہم ہوتا ہے کہ اب تک اس میں کن کن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے؟ اور کن اہم موضوعات پر مطالعات و تحقیقات کو ترجیحی طور سے سامنے لانے کی ضرورت ہے؟

اس اشاریے کی ترتیب و اشاعت کے لیے فاضل مرتب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ قرآنیات سے دل چسپی رکھنے والے ہر طالب علم کے مطالعے میں آئے اور ہر لائبریری کی زینت بنے۔

(محمد جرجیس کریمی)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی (۸۰)

☆ ۲۰/ جون ۲۰۲۱ء کو صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کو انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کی جانب سے چودھواں شاہ ولی اللہ ایوارڈ تفویض کیے جانے کی تقریب منعقد ہوئی۔ کورونا پروٹوکول کی وجہ سے یہ تقریب آن لائن ہوئی۔ اس موقع پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، پروفیسر اختر الواسع صدر مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ جودھ پور، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سکریٹری و ترجمان آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، جناب سید سعادت اللہ حسینی امیر جماعت اسلامی ہند اور پروفیسر محمد اشتیاق وائس چانسلر مگدھ یونی ورسٹی بودھ گیا (بہار) نے اظہار خیال کیا۔ ان حضرات نے مولانا عمری کی خدمات کی ستائش کی اور انھیں مبارک باد پیش کی۔

☆ مولانا عمری کے مضامین کا ایک نیا مجموعہ **'اقامتِ دین۔ مطلوبہ اوصاف اور تقاضے'** کے عنوان سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوا ہے۔ اس میں مولانا کی بعض وہ تحریریں اور خطابات شامل ہیں، جو مختلف مواقع پر دیے گئے۔ ان میں موجودہ حالات کے پس منظر میں اقامتِ دین کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے تقاضے واضح کیے گئے ہیں۔ صفحات: ۱۰۷، قیمت۔/۱۰۰/ روپے۔

☆ 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ' مولانا عمری کی مقبول کتابوں میں سے ہے۔ اب تک اس کے آٹھ (۸) ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ انگریزی زبان میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ حال میں جناب ایس۔ ایم۔ ملک نے تیلگو زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے، جس کی اشاعت تیلگو اسلامک پبلی کیشن ٹرسٹ حیدر آباد سے ہوئی ہے۔ کتاب بہت ہی نفیس اور اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ صفحات: ۲۳۶، قیمت: -/۱۸۰ روپے۔

☆ ۲۴/ جون ۲۰۲۱ء کو مجلس عام اور مجلس منتظمہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں معمول کے جائزے اور منصوبہ بندی کے ساتھ دو بڑے فیصلے ہوئے: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کو ادارہ کا نائب صدر و کارگزار صدر اور جناب نسیم احمد خاں کو خازن منتخب کیا گیا۔ دونوں حضرات نے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔

☆ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی کتاب 'زندگی کے عام فقہی مسائل' [جس میں ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی میں شائع ہونے والے فقہی مسائل سوالات و جوابات کو جمع کیا گیا ہے۔] کی پانچویں جلد مرکزی مکتبہ پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہو گئی ہے۔ صفحات: ۲۰۶، قیمت۔/۱۷۰/ روپے۔ اسی طرح اس کتاب کی جلد اول مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے، جس میں چالیس سوالات و جوابات (۶۸/ صفحات) کا اضافہ کیا گیا ہے، کا اضافہ شدہ ایڈیشن بھی طبع

ہو گیا ہے۔ صفحات: ۲۶۱، قیمت۔/۱۷۰ روپے۔

☆ یکم اپریل کو مولانا عبید اللہ طاہر فلاحی مدنی نائب مہتمم جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ نے 'علم و تحقیق میں جدید وسائل کا استعمال' کے موضوع پر ادارہ کے ارکان اور اسکالرس کے سامنے وقیع لیکچر دیا۔ اس میں مکتبہ شاملہ اور دیگر ڈیجیٹل لائبریریز کا تعارف کرایا اور ان کے طریقۂ استعمال پر تفصیل سے گفتگو کی اور عملی طور پر پروجیکٹر کے ذریعہ مشق کرائی۔ رکنِ ادارہ مولانا محمد انس مدنی نے مہمان گرامی کا تعارف کرایا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

☆ ۹/جون کو ادارہ میں پروفیسر وسیم احمد کی صدارت میں سورۂ الاعراف آیت ۱۷۲ کا اجتماعی مطالعہ کیا گیا۔ موصوف نے آیت زیرِ مطالعہ کی روشنی میں تخلیق انسانی کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ انسان اگر صرف اپنی تخلیق کے مختلف مراحل پر غور کر لے تو اس کے لیے اللہ کی ربوبیت کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ادارہ کے ارکان و اسکالرس نے مذاکرہ میں حصہ لیا۔ سکریٹری ادارہ مولانا اشہد جمال ندوی نے اختتامی کلمات میں مہمان محترم کا شکریہ ادا کیا۔

☆ شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے ۴/مئی ۲۰۲۱ء کو 'اعراب القرآن میں فراہی مکتبہ فکر کا حصہ' کے موضوع پر مذاکرہ ہوا۔ اس مجلس میں جناب ابوالاعلی سید سبحانی نے مذکورہ موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کیا اور سکریٹری ادارہ مولانا اشہد جمال ندوی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور مقالہ پر مبسوط تبصرہ کیا۔

☆ اہل علم اور مکتبات کی جانب سے ادارہ کی لائبریری کو برابر کتابیں ہدیۃً موصول ہو رہی ہیں۔ محدثات کے تذکرے پر مشتمل موسوعہ 'الوفاء باسماء النساء تراجم أعلام النساء فی الحدیث النبوی الشریف' مصنفہ ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، جو ۴۳/جلدوں پر مشتمل ہے، مصنف محترم کی خصوصی عنایت سے ادارہ کی لائبریری کو موصول ہوا۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اپنی ذاتی لائبریری سے ۹۵/قیمتی کتابیں لائبریری کو ہدیہ کیں۔ علاوہ ازیں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی جانب سے ۶۷/قیمتی کتابوں کا ہدیہ بھی موصول ہوا۔ ادارہ ان سب کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔

☆ ادارہ کا یو ٹیوب چینل ITTI ALIGARH اور فیسبک پیج idarah tahqeeq o tasneef e islami مقبول ہو رہا ہے، اس کے ناظرین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب تک دونوں جگہوں پر خطبات جمعہ، دروس قرآن، دروس حدیث، انٹرویوز، اسپیشل ٹاک اور سوال وجواب پر مشتمل ۱۶۱/ویڈیوز اپلوڈ ہو چکے ہیں۔ رمضان المبارک میں 'رمضان سیریز' کے نام سے درس قرآن، درس حدیث اور سوال جواب پر مشتمل ادارہ کے محققین و اسکالرس اور دیگر اہل علم کی ۶۲/ویڈیوز اپلوڈ کی گئی تھیں۔

ISSN:2321-8339

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI
ALIGARH

Vol. 40 No.3

July - September 2021

Editor

Syed Jalaluddin Omari

Asstt. Editor

Muhammad Raziul Islam Nadvi

Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Nabi Nagar (Jamalpur)، P.O. Box: 93

ALIGARH - 202 002 (INDIA)

www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

CONTENTS

1. The Consultative System of Islam 5

Syed Jalaluddin Umari

2. Besiegement in She'b-e-Abi Talib

An Important Chapterof the Prophet's Seerah 19

Dr. Mufti Mohammad Mushtak Tijarwi

3. The Style of Imam Tirmidhi in the Narration of

Ahadith-e-Ahkaam 41

Mrs. Saima Malik

4. A Comparative Study of Tafheem al-Qur'an

and Fi Dhilal al-Qur'an (2) 51

Dr. Uzma Khatoon

5. The Concept of Peace in the Holy Qur'an (In the Light

of International Rules of Prevention of Terrorism) 79

Maulana Muhammad Jarjees Karimi

6. The Education Theory of Iqbal And Its

Importance and Efficacy in the Present Age 95

Dr. Ali Mohammad Batt

7. Book Reviews 113

Activities of Idara-e-Tahqee-o-Tasneef-e-Islami 119

Abstract of the Articles

The Consultative System of Islam

Syed Jalaluddin Umari

President Idara -e-Tahqeeq-o- Tasneef-e- Islami

Much earlier (in 1965) a long article of Maulana Syed Jalaluddin Umari entitled 'Islam ka Shoorai Nizam' was published in the Zindagi-e-Nau Monthly, Rampur. Later it was republished in other magazines as well as in book form. The same article, after the Maulana reviewed it, is being published in Tahqeeqat-e-Islami. In this issue, its first part has been included.

In this part, it has been mentioned that the community system was found in the Quraish tribe before Islam. Qusai, who was chief of the tribe, held his power over all the sub-tribes of the Quraish and his majesty was widely acknowledged. This shows that the Quraish were acquainted with a system of governance which was deeply rooted in consultation.

The Qur'an enjoins consultation. One of the salient characteristics of believers mentioned therein is that their affairs are based on consultation. (Al-Shura:38) Many Ahadith also enjoin us to deal with our affairs in consultation. Islamic teachings say that a leader is bound to follow the suggestions of opinionmakers in dealing with the fundamental affairs of governance. However, he has the right to run the day-to-day affairs as per his farsightedness.

Besiegement in *She'b-e-Abi Talib*

An Important Chapter of the Prophet's Seerah

Dr. Mufti Mohammad Mushtak Tijarwi
Assistant Professor, Dept. of Islamic Studies,
Jamia Millia Islamia,New Delhi
muftimustak@gmail.com

The besiegement of Muslims in *She'b-e-Abi Talib* and their social boycott is an important chapter of the Prophet's Seerah and the history of Islam. Three years of the Makkan period was spent on this besiegement and boycott. During this period the Muslims, and in their support the entire Banu Hashim, had to undergo great sufferings. This article presents a research study on this subject.

The books of Ahadith, Seerah and History all mention this incident. Referring to these books, the article describes the history as well as the locus of *She'b-Abi Talib*. When did the besiegement begin? What were its causes? During this period, how did the besieged Muslims protect the Prophet? When other tribes decided to boycott Muslims and prepared its document, what was its content? Who was the scribe who wrote down the document? Where was the document preserved? Which tribes supported those who boycotted the Muslims? What was the period of the besiegement? How toilsome a life did the Muslims spend during this period? The article tries to provide answers for these questions.

The Style of Imam Tirmidhi, in the Narration of Ahadith-e-Ahkaam

Mrs. Saima Malik
G.C. University, Faisalabad, Pakistan
smalik.fsd@gmail.com

The chapters (abwaab) the Muhadditheen (Traditionalists) create while narrating ahadith in their books or the way they further elucidate the jurisprudential aspects of ahadith in their sayings bring out their jurisprudential prudence. Their elucidation helps us understand the ahadith and also eases jurisprudential ratiocination. In this regard the authority of Imam Tirmidhi is evident.

This article studies *Jami' al-Tirmidhi* from Abwab al-Taharah up till Abwab al-Janaiz. The writer, with the help of examples, expounds how the sayings of Imam Tirmidhi ascertain the meaning of certain ahadith or ratiocinate jurisprudential issues or explain some unfamiliar words of ahadith.

This article exemplifies the style of Imam Tirmidhi's hadith narration and hadith research.

A Comparative Study of Tafheem al-Qur'an and Fi Zilal al-Qur'an (2)

Dr. Uzma Khatoon
Alvi Mansion, New Sabzi, Azamgarh Road, Shahganj, Jaunpur (U. P.)
uzma.anam15@yahoo.com

Maulana Syed Abul A'la Maudoodi's Tafheem al-Qur'an (Urdu) and Syed Qutb Shaheed's Fi Zilal al-Qur'an

(Arabic) are significant exegeses (tafasir) of the present age. In various aspects, they are distinguished from other contemporary exegeses. This article makes a comparative study of both the exegeses. Its first part has been published in the last issue (April to June 2021) of Tahqeeqat-e-Islami.

In this issue, both the exegeses have been compared in respect of jurisprudential discussions, standpoint on scientific innovations, utilisation of modern sciences, criticism on western ideologies and theories, and reference to basic sources, and they have been illustrated with the help of examples. This indicates that there is harmony of thought to a great extent between the two.

The Concept of Peace in the Holy Qur'an

(In the Light of International Rules of Prevention of Terrorism)

Maulana Muhammad Jarjees Karimi
Member Idara-e- Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh
jarjeeskarimi@gmail.com

After 9/11 America declared a war on so-called terrorism; and, ignoring international norms, made armed attacks on Afghanistan and Iraq and heavily bombarded them. In these attacks thousands of innocent men, women and children were done to death. People were arrested on mere suspicion, contemptuous attitude was maintained during their investigation, they were deprived of right to defend, and they were treated monstrously in prisons. In this backdrop, this article highlights the concept of peace in the Holy Qur'an.

The writer has maintained that Allah the Exalted wants peace to flourish in the world. He has warned against killings and bloodbath. The Qur'an has condemned mischief on earth

and prescribed severe punishments for those involved therein. No one can be detained without any valid reason. The punishments Islam has prescribed can be implemented only after the crime has been established and proved. The moral teachings in the Qur'an lead to promotion of peace, safety and security. In social life too there are such teachings as can lead to the establishment of a healthy and peaceful society.

The Education Theory of Iqbal

And Its Importance and Efficacy in the Present Age

Dr. Ali Mohammad Batt
Assistant Professor, Dept. of Islamic Studies, Islamic University of Science and Technology,Awantipura, Srinagar (J&K)
alimohd1265@gmail.com

In his works, Allama Iqbal has talked about education and educational institutions. He has addressed both modern institutions of learning and traditional Islamic madrasas (seminaries). He has emphasised tarbiyah (training on Islamic footing). To him modern system of education is devoid of ethics. He says that education has a key role to play in the development of culture and civilization. Islam and the Qur'an is pivotal to his education theory. It is necessary that those who are receiving education are acquainted with Tawheed (Monotheism), Risalat (Prophethood), Akhirat (the Day of Judgement) and the fundamental values and ethics of Islam. To Iqbal, education is the integration of spiritual and material needs. Materialism fulfils physical needs whereas spirituality teaches man justice and equity, human brotherhood and equality. Iqbal's theory of education is a harmonious fusion of modern and Islamic studies. He believes that the basic purpose

of education is to ensure that people become civilized.

In this article the educational concepts of Iqbal have been presented in the light of his poetry and their contemporary significance has been pointed out.

BOOK REVIEWS

1. Uloom al-Qur'an: Ek Jaiza (Uloom al-Qur'an: An Analysis),Dr.Abu Sad Azmi,K.A.Nizami Centre for Quranic Studies, AMU, Aligarh, 2021, Pages: 152, Price:IRs.300/-
   Reviewed by Maulana M. Anas Falahi Madani

2. Rujoo, Fahm aur Tadabbur-e-Qur'an (Proclivity, Understanding and Tadabbur-e-Qur'an),Prof.Masood Ahmad, Idara Dawat Al-Qur'an, Lucknow, 2021 Pages:200 Price not mentioned.
   Reviewed by Maulana Muhammad Jarjees Karimi

3. Ishariya Shashmahi Uloom al-Qur'an, Aligarh (Index of Half-yearly Uloom al-Qur'an, Aligarh), Idarah Uloom al-Qur'an, Aligarh, 2021,Pages:112,Price:IRs.100/-
   Reviewed by Maulana Muhammad Jarjees Karimi

پروفیسر خورشید احمد کی 3 کتابیں

پروفیسر خورشید احمد کی مرتب کردہ کتاب 'اسلامی نظریہ حیات' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں زندگی کے اسلامی تصور کے تمام پہلوؤں کو مختصراً اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اسلام کے پورے نظامِ فکر و عمل کا ایک واضح نقشہ بن جائے اور اسلام کے تقاضوں کی سمجھ بھی اس میں پیدا ہو جائے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ایک طرف وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان دلائل سے بھی واقف ہو جائیں جو ان تعلیمات کی سچائی کو ثابت کرتے ہیں، اور دوسری طرف جس دین کے وہ ماننے والے ہیں اور جسے وہ اپنی عزیز ترین دولت سمجھتے ہیں، اس کی طرف دعوت دینے والے اور اسے پھیلانے والے بن کر اٹھیں۔ اس کتاب کو علمی و دینی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

کتاب کے تینوں حصے مکتبہ میں درج ذیل ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔

سائز: 23X36/16 صفحات: 136 قیمت: 130.00

سائز: 23X36/16 صفحات: 232 قیمت: 200.00

سائز: 23X36/16 صفحات: 216 قیمت: 190.00

MMI PUBLISHERS مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Mob: 7290092401, 7290092403

info@mmipublishers.net | mmipublishers@gmail.com mmipublishers.net

R.No. 38933/81
July-Sepetember 2021

Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

Mob. +91-9412671962
+91-9897746586

مولانا سید جلال الدین عمری کی تالیفات

شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیاتِ قرآن	۳۲۵/
۲	اسلام-انسانی حقوق کا پاسبان	۹۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/
۴	کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۵۰/
۶	خدا اور رسول کا تصور-اسلامی تعلیمات میں	۱۴۰/
۷	معروف و منکر	۱۸۵/
۸	اسلام کی دعوت	۲۲۵/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/
۱۱	تہذیب وسیاست کی اسلامی قدریں	۶۵/
۱۲	عورت-اسلامی معاشرے میں	۲۶۰/
۱۳	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ (مجلد)	۱۳۰/
۱۴	عورت اور اسلام • مجلد /۱۱۰ • عام	۶۰/
۱۵	اسلام کا عائلی نظام	۱۰۵/
۱۶	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۴۲/
۱۷	قرآن کا نظام خاندان	۲۴/
۱۸	اسلام-ایک دینِ دعوت	۲۵/
۱۹	دعوت و تربیت-اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/
۲۰	راہیں کھلتی ہیں • مجلد /۱۴۰ • عام	۹۵/
۲۱	سبیل رب۔دعوت الی اللہ کا راستہ	۴۵/
۲۲	اوراقِ سیرت	۲۵۰/
۲۳	خطبات پاکستان	۱۰۰/
۲۴	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/
۲۵	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۲۶	اسلام اور مشکلات حیات	۴۵/
۲۷	خدا کی غلامی-انسان کی معراج	۱۴/
۲۸	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۶/
۲۹	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۳۰	انفاق فی سبیل اللہ	۴۵/
۳۱	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۶/
۳۲	انسانوں کی خدمت-اسلام کی نظر میں	۱۶/
۳۳	جماعت اسلامی ہند-پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار	۴۳/
۳۴	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۱۸/
۳۵	ملک وملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۳۶	یہ ملک کدھر جارہا ہے؟	۳۵/
۳۷	بچے اور اسلام	۱۴/
۳۸	خاندان کی اصلاح اور اولاد کی تربیت	۲۰/
۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۲۵/
۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۴/

ملنے کے پتے:

۱- ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ۔۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵